www.Paksociety.com

موجود تھے۔ سر آئزک نے دوبارہ مجھے تمام روداد پڑھ کر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی انتظامیہ میرے تحریری جواب سے مطمئن نہیں ہو پائی لہٰذا میرے ایک سمسٹر کے لیے معطلی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا ہے۔ مَیں نے براہِ راست سر آئزک کی آنکھوں میں دیکھا لیکن وہ نظر چُرا گئے، میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آج ہفتے کا دن ہے۔۔۔۔اور مَیں جانتا ہوں کہ چیئرمین انکوائری کمیٹی مسٹر آئزک کے لیے یہ کس قدر مقدس دن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ آج کے دن کوئی جانبدارانہ فیصلہ نہیں کریں گے۔''

ہفتہ یہودیوں کے لیے ویسا ہی مقدس دن ہوتا ہے، جیسا ہمارے لیے جمعہ، مسٹر آئزک میرے اس طنز کو سمجھ گئے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جیوری نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے مزید اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہنا۔ مَیں نے انکار میں سر ہلایا۔ جیوری نے فیصلے پر دستخط کے لیے اپنے اپنے قلم اُٹھا لیے۔

پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور سارہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ سر آئزک نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''مس سارہ۔۔۔۔کیا آپ نہیں جانتیں کہ آج ڈین آفس میں روزانہ کے معمولات نہیں نپٹائے جا رہے۔ آج یہاں ایک اہم انکوائری کا فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔'' سارہ نے جلدی سے اپنی سانس درست کی۔

''مَیں بھی اُسی انکوائری کے سلسلے میں جیوری کی مدد کرنے آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیان کمیٹی کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے گا۔''

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارہ کو کسی بھی طریقے سے کمرے سے باہر بھجوا دیں۔ لیکن بات چونکہ دوسرے ممبران پر بھی کھل چکی تھی لہٰذا انہیں مجبوراً سارہ کو برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے پھر بھی حتمی لہجے میں کہا اور اس بار ان کے لہجے میں شدید سختی تھی۔

''مَیں نہیں سمجھتا مس سارہ کہ اس موقعے پر کسی مزید بیان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر حماد خود اپنا فائنل بیان دے چکے ہیں۔ اور ہم نے فیصلہ بھی سنا دیا ہے بس اس فیصلے پر ہمارے دستخط ہونا باقی ہیں۔''

سارہ شاید ان کے لہجے میں چھپی دھمکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے بھی حتمی لہجے میں ہی کہا۔

''کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انصاف کے تمام تقاضے نہ پورے کیے جائیں۔ مَیں اس واقعے کی عینی گواہ ہوں اور مجھے آج تک کمیٹی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مسٹر حماد نے میرا نام بطور گواہ کمیٹی کو پیش کیا تھا۔۔۔۔؟ بہر حال میں یہ بیان دینے آئی ہوں کہ اس تمام واقعے میں مسٹر حماد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جم نے ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور میرے سامنے حماد کو یونیورسٹی سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں حماد نے جم سے کچھ نہیں کہا۔''

سر آئزک کا بس چلتا تو اُسی وقت سارہ کو وہاں سے غائب کروا دیتے۔

سارہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی ایک لمبی سی فہرست لہرائی۔

''یہ ان چالیس طلباء کی فہرست ہے جن کے سامنے یہ سارا واقعہ اس دن پیش آیا تھا۔ یہ سب بھی اس وقت میرے ساتھ ہی آئے ہیں اور آپ کے آفس کے باہر اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے جمع ہو چکے ہیں۔ اگر کمیٹی اجازت دے تو ان سب کا بیان بھی ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔''

گویا سارہ پورا انتظام کر کے آئی تھی۔ سر آئزک کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

''نہیں۔۔۔۔اس کی ضرورت نہیں ہے، ان بدلے ہُوئے حالات میں کمیٹی کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی، جیوری ممبرز کی کیا رائے ہے۔''

تمام جیوری کے ممبران نے یہ بات تسلیم کی کہ سارہ کے بیان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ لہٰذا نظرِ ثانی کے لیے انہیں تین دن کی مہلت دی جائے۔ سر آئزک کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی اور جب مَیں ڈین کے کمرے سے باہر نکلا تو میری پوری کلاس اور یونیورسٹی کے اور بہت سے طلباء باہر میرے انتظار میں اکٹھے تھے۔ سارہ نے جب انہیں بتایا کہ میرے خلاف فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے تو سب سے پہلے چلّانے اور نعرہ لگانے والی ربیکا تھی۔ پھر اس کے بعد تو

www.Paksociety.com

وہ شور مچا کہ اندر سے سر آئزک کا پی۔اے گھبرا کر باہر نکل آیا اور سب کی منت کرنے لگا کہ ہم یہاں سے دُور چلے جائیں کیونکہ سر آئزک ناراض ہو رہے ہیں۔ ربیکا نے فوراً ہی پوری یونیورسٹی کو اسی وقت ایک بڑی ٹریٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ بقول اس کے، اس کے باپ کے آسٹریلین پاؤنڈ کس دن کام آئیں گے۔ سب لوگ ہنستے، شور مچاتے کیفے ٹیریا کی طرف چل پڑے لیکن سارہ خاموشی سے دوسری جانب پلٹ گئی۔ میری نظر اس پر تب پڑی جب وہ مرکزی عمارت سے باہر جانے والی راہداری میں مُڑ رہی تھی۔ مَیں فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ تب تک وہ کافی آگے جا چکی تھی۔

''سارہ۔۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔۔ پلیز رکو۔''

وہ ٹھہر گئی، مَیں اُس کے قریب پہنچا۔

''شکریہ۔''

''کس بات کا۔''

''میرا ساتھ دینے کا، آج اگر تم وقت پر نہ آتیں تو کیس میرے خلاف جا رہا تھا۔''

''مَیں نے تمھارا نہیں سچ کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔''

''اس دنیا میں سچ کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی اُن میں سے ایک ہو۔''

سارہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''تو پھر خدا کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے ان نایاب لوگوں میں سے ایک سے تمھاری ملاقات کروا دی۔''

مَیں بھی اس کی بات سُن کر مسکرا دیا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن وہ شکریہ مَیں اس سے اکیلے میں کہہ دوں گا۔ فی الحال تمھارا شکریہ۔'' مَیں پلٹا اور واپس جانے لگا۔ سارہ نے کچھ سوچ کر مجھے آواز دی۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ تم نے انکوائری کے سامنے گواہی کے لیے میرا نام کیوں دیا۔ مَیں تو خود ان میں سے ایک تھی جو تم سے جھگڑ رہے تھے۔''

''پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ مجھے تم ایک سچی لڑکی لگتی ہو، سوچا کہ ایک بار اپنا یہ بھرم بھی آزما ہی لوں۔

سارہ ہنسی، پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ ہنسنے سے اُس کے گالوں میں دو ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

''واہ۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔ کیا موقع ڈھونڈا ہے جناب نے اپنے بھرم آزمانے کا، مَیں اگر وقت پر نہ پہنچتی تو۔۔۔؟''

''میرا سچ پر سے یقین اُٹھ جاتا۔''

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''کافی خطرناک لگتے ہو، ''وش یو بیسٹ آف لک'' Wish you best of luck۔

سارہ ہنستی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔ بعد میں ربیکا نے مجھے بتایا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے طلب ہی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ جم بہر حال اس کا بہت پُرانا اور سب سے اچھا دوست تھا، لیکن جب ربیکا نے سارہ کو یہ بتایا کہ خود مَیں نے انکوائری کمیٹی کے سامنے سارہ کا نام بطور گواہ دیا ہے تو وہ چند لمحوں کے لیے تو سن ہو کر ہی رہ گئی تھی۔ اُسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسی پر یہ سارا معاملہ ڈال دوں گا۔ ربیکا کو اب تک اس بات پر حیرت تھی کہ سارہ میرے حق میں گواہی دینے پر کیسے راضی ہو گئی۔ نہ صرف خود بلکہ اس نے آدھی یونیورسٹی کو بھی اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا۔ ربیکا سے ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سر آئزک سارہ سے اس بات پر اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دن انہوں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ جانے سارہ نے اس سارے معاملے کو کس طرح سے نپٹایا ہوگا۔ واقعی وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

تیسرے دن کمیٹی نے مجھے اور جم دونوں کو ڈین کے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ میرے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا لہٰذا مجھے بری کیا جا رہا ہے، جبکہ جم کو ایک سیمسٹر کے لیے یونیورسٹی چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے بعد بھی یونیورسٹی انتظامیہ اُسے واپس لینے سے پہلے کمیٹی بٹھائے گی۔ جم کا چہرہ لٹک گیا۔ مَیں نے ڈین سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔ ڈین نے اجازت دے دی۔

''سر میری جم سے کوئی ذاتی جنگ نہیں ہے۔ اس دن میں شاید اس کی بات ٹھیک طرح

www.Paksociety.com

سے سمجھ نہیں پایا جب کہ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جم اور ڈیوڈ کا ایک سنجیدہ قسم کا مذاق تھا۔ لیکن ردعمل اس تیزی سے ہوا کہ ہم میں سے کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مَیں جیوری سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی معمولی بات کے لیے جم کو یونیورسٹی سے خارج نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کو اس مذاق کے لیے بھاری جرمانہ کر دیا جائے تو بھی ہم اسے انتظامیہ کی میزبانی سمجھیں گے۔"

جم حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیوری نے میرے "سچ" کی تعریف کی اور ہم دونوں کو ایک تنبیہہ کے بعد کلاس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جم کو کچھ کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے روک لیا گیا اور مَیں ڈین آفس سے نکل آیا۔

اگلے دن مَیں کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ نینسی میڈیم اکنامکس کا لیکچر دے رہی تھیں کہ جم کلاس میں داخل ہوا۔ وہ ویسے بھی کلاس میں آنے جانے کے لیے کبھی اجازت لینے کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھا اور میرے ڈیسک کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ خود نینسی میڈیم کی آواز بھی حلق سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر گھورتا رہا۔ کلاس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ربیکا نے میرا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا۔ پھر جم نے بناء کچھ کہے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر پھیلا دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جم نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ربیکا نے جانے کہاں سے سیٹی مارنا سیکھ لی تھی۔ اُس کی سیٹیاں کلاس میں گونجتی رہیں۔ میری نظر سارہ پر پڑی وہ دُور بیٹھی مسکرا رہی تھی میرے دل نے کہا۔ "محبت فاتح عالم۔۔۔"

OO

بے خودی

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ لیکن یہ جگہ تو میرے لیے کچھ غیر مانوس سی تھی۔ میں کچھ دیر تک گم صم سا لیٹا یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ رات کو تو خیرو مجھے تانگے میں لاد کر اسٹیشن کے لیے ہی نکلا تھا۔ پھر یہ کشادہ سا کمرہ صاف ستھرا بستر، اُجلے اُجلے سے پردے اور بڑے بڑے سے روشن دانوں اور کھڑکیوں والا ٹین کی سیون ٹائپ چھت والا کمرہ کس کا تھا؟

کچھ فاصلے سے ٹرین کا بھونپو بجا اور ٹی ٹی کی سیٹی سنائی دی۔ مطلب یہ جگہ اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ پر یہ کس کا گھر ہے؟ مَیں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر اُٹھاتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر کی جگہ لوہے کا کوئی بھاری گولہ میرے کاندھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو۔ میں ایک کراہ کے ساتھ سر پکڑ کر دوبارہ ڈھے سا گیا۔ میری آواز سن کر باہر کچھ آہٹ ہوئی اور پھر صدیقی صاحب ہاتھ میں کچھ گولیاں اور جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے مجھے کاندھے سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

"لیٹے رہو۔۔۔ ابھی تمھاری حالت پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔"

"لیکن سر مَیں۔۔۔۔ یہاں۔ کیسے؟"

"میاں تم خود تو کبھی کچھ بتاتے نہیں ہو۔۔۔ جانے سارا درد خود ہی سہنے کی یہ کیا ضد ہے تمھاری۔ پر تمھارا بھی قصور نہیں ہے۔ شاید یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر دو گولیاں میرے منہ میں ڈال کر زبردستی آدھا گلاس پانی میرے حلق سے نیچے اُتار دیا۔ مجھے انہیں یوں اپنی خدمت کرتے دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ مَیں نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

"سر مَیں اب ٹھیک ہوں۔ پر میں یہاں آیا کیسے؟"

انہوں نے تکیہ میری پشت پر سیدھا کر کے مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔

www.Paksociety.com

''خیر تمھیں شدید بخار اور ہذیان کی کیفیت میں تین دن پہلے رات کو یہاں اپنے تانگے پر ڈالے لایا تھا۔''

میں اُچھل ہی تو پڑا۔

''تین دن پہلے۔۔۔۔لیکن مَیں تو کل رات۔''

''ہاں میاں۔۔۔تم تین دن تک تقریباً بے سدھ ہی بخار میں پڑے سڑتے رہے ہو۔ میں نے سوچا ریلوے کے ہسپتال سے بہتر ہے کہ یہیں گھر پر ہی تمھاری نگہداشت کی جائے۔ ڈاکٹر روزانہ تین وقت آتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ آج صبح سے بخار کچھ ٹوٹا ہے۔ لیکن ابھی تم کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی بھی قسم کی ضد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤ یہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔''

یا خدا۔۔۔ میں تین دن سے اس بیماری کی حالت میں یہاں اس شریف انسان پر بوجھ بنا رہا۔ مجھے اپنی کیفیت پر غصہ آ گیا۔ میں نے انہیں اتنی تکلیف پہلے ہی دے دی تھی۔ اب مزید نہیں۔

''سر آپ یقین کریں مَیں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ پہلے ہی تین دن آپ اور آپ کے گھر والوں پر بوجھ بنا رہا ہوں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔''

''میاں پہلے تو یہ بوجھ والی بات واپس لے لو۔ دوسری بات یہ کہ میں اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ بیوی سے مزاج مل نہیں پایا لہٰذا وہ سال میں دس مہینے میکے میں ہی گزارتی ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس مَیں ہوں اور گھر کے دو چار نوکر ہیں۔ خوب مزے میں کٹ رہی ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''ویسے بھی آدمی بنا شادی کے تنہا رہے تو اتنا مزہ نہیں آتا جتنا شادی کے بعد بیوی کے میکے جا کر رہنے کی صورت میں تنہائی میسر آنے کے بعد آتا ہے۔ یقین نہ آئے میری بات پر تو شادی کے بعد بیوی کو میکے بھیج کر کبھی تنہا رہ کر دیکھنا۔''

مَیں بھی مسکرا دیا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے سر۔۔۔۔لیکن میں اس طرح یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں

جانتا ہوں میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوتا رہا ہوں۔''

''ارے یار تنہائی تو اپنی جنم جنم کی ساتھی ہے، وہ بھی میرے ساتھ رہتے رہتے کبھی کبھی اُکتا سی جاتی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''میری لاکھ ضد کے باوجود صدیقی صاحب نے مجھے اس گھر سے تو کیا اس کمرے سے بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ البتہ شام کو جب نوکر نے برآمدے میں چائے لگ جانے کی اطلاع دی تب وہ مجھے لیے برآمدے میں آ گئے۔۔

کوئٹہ میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک ذیلی سڑک آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ایک مرکزی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی سڑک سے ملی ہوئی ہے یہ ٹھنڈی سڑک جسے عرف عام میں کالون روڈ کہتے ہیں۔ اسی ٹھنڈی سڑک پر ریلوے کے بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب کا چھوٹا سا بنگلہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ریلوے کی مخصوص برٹش دور کی طرز تعمیر والے سُرخ ٹین کی چھت والے یہ بنگلے خاص طور پر کوئٹہ کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی راج میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کمروں کے باہر برآمدہ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مخصوص لکڑی کے سبز رنگ کیے ہوئے ستون، برآمدے کو تھامے ہوئے تھے اور برآمدے کے سامنے کشادہ سا باغیچہ جس میں انار، انگور، سیب اور ناشپاتی کے درخت اور بے تحاشا پھول لگے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کافی اعلیٰ ذوق معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

''اپنی بے ہوشی کے ہذیان میں تم بہت کچھ بولتے رہے ہو۔ لیکن اس میں سے زیادہ تر باتیں تم اُردو میں نہیں بلکہ انگلش میں کر رہے تھے۔ شاید تم اپنے گھر میں زیادہ اُردو نہیں بولتے تھے؟''

جس بات کا مجھے ڈر تھا، صدیقی صاحب نے وہی بات آخر پوچھ ہی لی۔ مَیں پہلے ہی یہ سن کر چونک گیا تھا کہ مَیں تین دن بے ہوشی کے عالم میں یہاں پڑا رہا ہوں جانے اپنے ہذیان میں کیا کیا بک گیا تھا مَیں۔۔۔۔؟

مَیں چند لمحے چُپ رہا، صدیقی صاحب نے بات جاری رکھی۔

''اگر تم نہ بتانا چاہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ مَیں جس دن تم سے پہلی مرتبہ ملا

www.Paksociety.com

تھا۔اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو تم دوسروں کو نظر آتے ہو۔تمھاری آنکھیں، تمھارا لہجہ، تمھارے ہاتھ ۔۔۔۔ سب تمھیں ان لوگوں سے الگ دکھاتے ہیں جن میں تم اتنے دنوں سے رہ رہے ہو۔مَیں نہیں جانتا کہ تمھاری کیا مجبوری ہے۔لیکن بے ہوشی کے دوران تمھارے منہ سے اس قدر شستہ انگریزی سُن کر مجھے کچھ زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی۔لیکن زمانے سے اس قدر ناراضگی بھی اچھی نہیں ہوتی۔کبھی کبھی کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو جاتا ہے۔''

مَیں آہستہ سے بولا۔

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص زیادہ ہے بھی نہیں۔ایک مقصد کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا جو اَب میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔اب میری زندگی اور میرے دن اور رات کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔اور شاید یہ مختصر زندگی اب اسی کھوج میں کٹ جائے گی۔بس اتنا سا فسانہ ہے میرا۔''

صدیقی صاحب کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''ہوں ۔۔۔۔خوش نصیب ہو گویا۔۔۔کوئی مقصدِ عشق تو ہے زندگی میں اور سچ مانو تو یہی زندگی کا حاصل بھی ہے۔اگر کبھی میں اس سلسلے میں تمھارے کسی کام آ سکوں تو مجھے ضرور بتانا۔اپنی بھی حسرت ہے میاں کہ زندگی میں کچھ تو ایسا کر جائیں جس پر ہمیں بھی ناز ہو۔ (عشق نہ سہی۔۔۔۔معاونتِ عشق ہی سہی۔)

صدیقی صاحب نے کچھ اس طرح سے ''معاونتِ عشق'' کی اصطلاح استعمال کی جیسے خالص پولیس والے کسی کے لیے ''معاونتِ جرم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

دو دن مجھے صدیقی صاحب نے بالکل کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔تیسرے دن بڑی مشکل سے میں نے اپنی واپسی کے لیے رضامند کیا۔وہ بھی اس شرط پر کہ میں ہر روز شام کو چائے پر ان سے ملنے ضرور آؤں گا۔انہوں یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی دن ناغہ کیا تو وہ خود ڈرائی پورٹ کے گوداموں سے مجھے لے جانے کے لیے آ پہنچیں گے۔ان کا آخر تک یہی اصرار رہا کہ مَیں ان کی طرف ہی منتقل ہو جاؤں۔مجھے مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے

مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے میری گذشتہ زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔مَیں نے انہیں بصد مشکل یقین دلایا کہ میرے وہاں نہ رکنے کی وجہ میرا ماضی یا صدیقی صاحب کے سوالوں کا خوف نہیں ہے۔بلکہ میرے وہاں رکنے سے میرے اس مقصد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے جس کے لیے میں گھر بار تیاگ کر یہاں اسٹیشن پر آ بیٹھا تھا۔

بڑی حُجت کے بعد مَیں نے ساتویں دن کی شام انہیں ان کے بنگلے کے گیٹ سے مِل کر واپس اندر بھیجا ورنہ وہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے جانے پر بضد تھے۔ان کے گھر سے نکل کر مَیں ٹھنڈی سڑک پر پیدل اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا عجیب اور مہربان شخص ہے۔ایک اجنبی کو اس نے سات دن میں ہی اتنا اپنا لیا کہ اس کی واپسی پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔واقعی، انسان ہی انسان کا سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میرے پہنچتے ہی سب کو خبر ہو گئی اور وہ سب میرے آس پاس یوں جمع ہوتے گئے جیسے شہد کے چھتے پر مکھیاں ۔۔۔۔

سب ہی کو فرداً فرداً یقین دلانا پڑا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ان میں سے کئی تو مجھ سے یوں پرتپاک انداز میں گلے ملتے رہے جیسے میں کسی محاذ جنگ سے واپس لوٹا ہوں۔پھر مجبوراً غفورے کو مداخلت کرنا پڑی اور اُس نے اپنی گرج دار آواز میں سب کو حکم دیا کہ بابو حماد کی طبیعت ابھی مشکل سے سنبھلی ہے۔اگر سب میرے گرد یونہی جمع رہے تو مجھے آرام کا موقع نہیں ملے گا لہٰذا فی الحال سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔غفورے کا حکم ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی۔غفورے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بینچ پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''میں جانتا تھا باؤ ۔۔۔۔تم زیادہ دن صدیقی صاحب کے گھر نہیں ٹکو گے۔اور سیدھے یہیں واپس آؤ گے۔تم اس گھر کا آرام اور سکھ زیادہ دن برداشت نہیں کر پاؤ گے، تمھیں اَب بے آرامی اور بے سکونی میں ہی سکھ ملتا ہے۔''

وہ شاید میرے صدیقی صاحب کے گھر سے واپس چلے آنے پر خفا تھا۔میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ناراض ہو؟''

www.Paksociety.com

''جانے دے باؤ۔۔۔اپنی ناراضی کس کام کی۔تُو نے غفورے کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں، ورنہ اس مولوی والی بات کو مجھ سے نہ چھپاتا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں باؤ۔۔۔خیرو تانگے والے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔قصور اس کا بھی نہیں تھا۔اس دن جب تم بخار میں اس مسجد میں اندر گئے اور پھر بہت دیر تک باہر نہیں نکلے تو خیرو گھبرا کر تمھارے پیچھے اندر مسجد میں گھس گیا تھا کہ کہیں تمھاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔پر اندر جانے سے پہلے ہی اس نے تمھاری اور مولوی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔پر خیرو بھی یاروں کا یار ہے۔اس نے یہ باتیں اور کسی کو نہیں بتائی ہیں۔وہ تمھیں صدیقی صاحب کے گھر چھوڑ کر سیدھا میرے پاس آیا تھا۔شاید وہ مجھے کبھی کچھ نہ بتاتا۔پر وہ تیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ کہیں تجھے کچھ ہو ہی نہ جائے۔اگر ایک آدھ دن مزید تیری حالت نہ سدھرتی تو ہم سیدھے تیرے گھر چلے جاتے بتانے کے لیے۔''

میں پھر حیرت سے چونکا۔

''میرے گھر۔۔۔؟''

''ہاں باؤ۔۔۔خیرو نے سن لیا تھا جو بھی اس مولوی نے کہا تھا۔تُو لاٹ صاحب کا بیٹا ہے، ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔''

شاید غفورا کمشنر صاحب کو ہی لاٹ صاحب کہہ رہا تھا۔مولوی صاحب نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ تم جہاں بھی جاؤ گے کمشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے۔مطلب میرا ہر راز کھل چکا تھا۔شاید اب یہاں سے بھی میری رخصت کا وقت ہو ہی چلا تھا۔آج نہیں تو کل یہ سب لوگ میری اصلیت جان جائیں گے۔مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔غفورا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے۔

''لیکن خبردار جو تو نے اب یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچا بھی تو۔قسم مولا کی، میں تجھے رسیوں سے باندھ دوں گا اور سب کو بتا دوں گا کہ یہ کون سا شہزادہ اتنے دن سے ہمارے بیچ رو رہا ہے۔''

مجھے غفورے کی بات پر ہنسی آ گئی۔اس نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور روہانسا سا ہو کر بولا۔

''دیکھ باؤ۔۔۔تجھے میری دوستی کا واسطہ۔۔۔اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کوئی بھی بات باہر نہیں نکلے گی۔پر تُو اگر یہاں سے چلا گیا تو غفورا زندگی بھر اپنا چہرہ نہیں دیکھ پائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔میں کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔میں روزانہ کی طرح اپنا سارا کام خود ہی کروں گا۔تم مجھ سے دوستی میں یا میرے گھر کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص سلوک نہیں کرو گے۔ورنہ میں ایک دن بھی یہاں نہیں رکوں گا۔''غفورے نے خوشی سے میرے ہاتھ چوم لیے۔پھر اس کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی۔

''تُو واقعی اس دنیا کا نہیں ہے، پر تیری محبت کی قدر یہاں کون جانے گا۔۔۔''؟ تو بولے تو میں خود جا کر اس مولوی کے پیروں میں گر جاؤں گا۔ساری زندگی اس کی غلامی کروں گا۔بس تو ایک بار حکم کر دے۔''

''نہیں۔۔۔یہ معاملہ حکم کا نہیں ہے۔عرض کا ہے۔۔۔میں نے بھی اپنی عرضی ڈالی ہوئی ہے۔اب سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

غفورے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک خاص سی عقیدت در آئی تھی۔وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔کچھ دیر کے لیے خیرو تانگے والا بھی آیا اور بہت دیر تک مجھ سے گلے مل کر اس نے مجھے جکڑ رکھا۔یہ غریب لوگ بھی جذبوں کے معاملے میں کتنے امیر ہوتے ہیں۔جس کسی کو ایک بار دل میں بٹھا لیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔بس شرط صرف اتنی سی ہے کہ کوئی ان کے دل کو چھو لینے والا ہونا چاہیے۔خیرو اور غفورے دونوں نے میرے دل کی آرزو کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے مولوی صاحب یا میرے گھر والوں کی کوئی بات نہیں کی۔بس ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔وہ دونوں ایک معاملے میں ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔دونوں کا پسندیدہ فلم اداکار دلیپ کمار تھا اور دونوں ہی ہمہ وقت خود کو دلیپ کمار کا حقیقی پرستار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش میں لگے رہتے تھے۔

خیرو ہر وقت کسی ایک فلم کا حوالہ دیتا تھا جس میں دلیپ صاحب نے تانگے بان کا

www.Paksociety.com

کردار ادا کیا تھا اور خیرو بتاتا تھا کہ جس دن سے اس نے وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم دیکھی ہے تب سے وہ دلیپ کمار کی طرح ہی تانگہ چلاتا ہے۔

وہاں غفورے کو ایک ایسی فلم یاد تھی جس میں اس کے پسندیدہ ہیرو نے مزدور لیڈر کا رول بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جس طرح غفورا خود اصل زندگی میں تھا۔ عام طور پر جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو میں جان بوجھ کر دلیپ کمار صاحب کی کوئی بات چھیڑ دیتا تھا جس کے بعد گھنٹوں ان دونوں کی بحث جاری رہتی اور یہ بحث آخر کار دونوں کے اس دن کے جھگڑے کی صورت میں ختم ہوتی۔ اس دن بھی خیرو غصے میں روٹھ کر چلا گیا کیونکہ غفورے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ دلیپ کمار جیسے بڑے اداکار کو تانگے بان جیسا معمولی کردار ادا ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہم دونوں خیرو کے اس جذباتی پن میں اُٹھ کر چلے جانے پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ پھر اچانک جیسے غفورے کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے اپنے ہی سر پر زور سے ایک چپت ماری۔

''دھت تیرے کی غفورے۔۔۔۔ پھر بھول گیا نا۔۔۔۔''

میں نے حیرت سے غفورے کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا، کچھ بھول گئے ہو کیا۔''

''باؤ تیرے آنے کی خوشی میں دیکھ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ تیرے بیمار پڑنے کے بعد پچھلے ہفتے میں ایک داڑھی والا جوان سالڑ کا دو بار تیرے پوچھتے ہوئے اسٹیشن آیا تھا۔۔۔ بھلا سا نام بتایا تھا اُس نے۔۔۔۔''

غفورا ماتھے پر ہاتھ رکھے نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک سی گئی اور میں نے سرسراتی سی آواز میں نام دہرایا۔

''عبداللہ''

غفورے نے خوشی میں زور سے تالی ماری۔

''ہاں۔۔۔۔ عبداللہ۔۔۔۔ یہی نام بولا تھا اُس نے۔۔۔۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے تیری بیماری کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ کل پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے یہ پیغام دے دوں کہ ٹھیک ہوتے ہی شاکر صاحب سے مل لینا۔۔۔۔ شاید کوئی ضروری کام ہو؟

میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ عبداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے مجھے شاکر سے ملنے کا کیوں کہا ہے؟۔۔۔۔ کہیں مولوی صاحب کی طبیعت۔۔۔؟ نہیں۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ لیکن عبداللہ تو خود یہاں نہیں تھا۔ وہ تو ایمان اور اُن کے گھر والوں کو لے کر مچھ گیا ہُوا تھا۔ اور جس دن میں مولوی صاحب سے آخری مرتبہ مسجد میں ملا تھا تب تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ میرا دل جانے کیوں ڈوبنے لگا تھا۔ مغرب کی اذان کا وقت تھا۔ میں نے خیرو کو فوراً پیغام بھجوایا کہ تانگہ تیار رکھے۔ ہم ابھی کہیں کے لیے نکل رہے ہیں۔ غفورے نے مجھے لاکھ منع کیا کہ ابھی دیر ہو گئی ہے اور میری حالت بھی پوری طرح نہیں سنبھلی ہے۔ میں کل شاکر سے ملنے چلا جاؤں لیکن اب میرے دل کو ایک پل بھی قرار نہیں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے ہی پُرانی حویلی پہنچ جاؤں۔

خیرو جس رفتار سے تانگہ بھگا سکتا تھا، بھگا رہا تھا۔ میں نے اسے جلد از جلد پُرانی حویلی پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر کی مرکزی سڑکوں پر کچھ خاص رش نہیں تھا، جلد ہی ہم شہر کے مضافات میں حویلی کو جاتی ہوئی لمبی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ میں اپنے ہی وسوسوں اور خیالات میں ڈوبا ہوا تھا خدا خیر ہی کرے۔۔۔

میں اس وقت چونکا جب خیرو نے حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر زور سے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں، میں نے خیرو کو وہیں رکنے کے لیے کہا۔

نگہت حویلی کے دالان میں ہی کچی خوبانیوں کو جو شاید دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالی گئی تھیں، حویلی کے نوکروں سے جمع کروا رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی تیزی سے میری طرف آئی۔ کچھ دیر تو اسے اپنا سانس سنبھالنے میں ہی لگ گئی۔ وہ میرے چہرے اور ہاتھوں کو بے تابی سے ٹٹولتی رہی۔

''کیا ہو گیا تھا آپ کو بھیا۔۔۔۔ بیمار کیسے ہو گئے تھے۔۔۔۔ کتنے کمزور لگ رہے ہیں۔۔۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔''

مجھے اس کے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی بیماری کے بارے میں مختصراً بتانا پڑا پھر میں نے چھوٹتے ہی اس سے شاکر کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ میں نے نگہت کو عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی بتایا۔

نگہت نے شاکر کے بارے میں تو یہ بتایا کہ وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی جانتی ہے لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔۔۔

مجبوراً مجھے اس کو اپنی قسم دینی پڑی۔ نگہت شاید پہلے ہی بہت دیر سے ضبط کر رہی تھی۔ میرے یوں اصرار کرنے پر اس کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل تو پہلے ہی ہول کھائے جا رہا تھا۔ نگہت کی یہ حالت دیکھ کر تو جیسے ہی میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔

''خدا کے لیے نگی۔۔۔۔ کچھ تو بتاؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔۔ مولوی صاحب کے گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔۔۔۔ ایمان تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔''

نگہت نے عجیب زخمی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کوئی پانی پلانے والا حسرت سے کسی دم توڑتے سپاہی کو میدانِ جنگ میں آخری گھونٹ سے پہلے ہی اس کی سانس رکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

''مولوی صاحب نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے ماہ کی پندرہ کو اس کی رخصتی ہے۔''

چند لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری سننے، سمجھنے، دیکھنے اور بولنے کی تمام حسیات چھین لی گئی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس صرف اک خلا سا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اتنی غیر متوقع بات بھی نہیں تھی۔ اس دن میری مولوی صاحب سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر انہیں کچھ ایسا ہی قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ وہ کسی صورت میرا ایمان کے لیے رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی بدنامی اور زمانے کی باتوں کا خوف بھی ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ میری دیوانگی اور وحشت بھری حالت کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شریف باپ کو وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ خبر میرے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نگہت کو میری اندرونی حالت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ بہت دیر تک میرے لرزتے ہاتھ پکڑے وہیں کھڑی رہی۔

انسانی اعصاب کا کھیل بھی عجیب ہے۔ شاید ایک انسان کے اندر بیک وقت یہی ایک چیز ہوتی ہے جو سب سے کمزور اور سب سے زیادہ مضبوط ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب کو ایک دن مر جانا ہے۔ پھر بھی کسی اپنے کی موت کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے تو ہمارے اعصاب سُن سے ہو جاتے ہیں۔ شاید ہم جانتے ہوئے بھی ہر لمحہ خود کو اس انہونی کے نہ ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ایمان کے کہیں رشتہ طے ہو جانے کی بات بھی میرے لیے اور میرے اعصاب کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خبر تھی۔ دراصل کچھ باتوں کی سنگینی کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ سرزد ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی روح نچوڑ دینے والا تھا کہ وہ نازنین کسی اور کی ہونے والی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم دونوں میں تو آج تک کبھی کھل کر بات بھی نہ ہونے پائی تھی، تب میرا یہ حال تھا اگر کہیں اس کی طرف سے بھی قول و اقرار ہو چکا ہوتا تو شاید میرا دل وہیں پھٹ جاتا۔

بہت دیر تک مَیں اور نگہت خاموش کھڑے رہے۔ حویلی کے بلند و بالا درختوں کے پرندے بھی ڈھلتی شام کے ساتھ گھر واپسی پر شور مچاتے مچاتے چُپ ہو گئے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ پھر مَیں نے ہمت مجتمع کی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں نگہت سے پوچھا۔

''کون ہے وہ۔۔۔۔ کس کے ساتھ ایمان کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

''اس کے چچازاد۔۔۔ عبداللہ کے ساتھ۔''

''عبداللہ۔۔۔۔ لیک۔۔۔ لیکن۔۔۔۔''

لفظ میرے منہ میں ہی ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا پہاڑ تھا جو انہی چند لمحوں میں میرے سر پر ٹوٹا تھا۔ عبداللہ تو میری دیوانگی کا خود شاہد تھا۔ پھر عبداللہ۔۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔۔؟ میرے ذہن میں خیالات گڈمڈ سے ہونے لگ گئے تھے۔ نگہت نے بتایا کہ مجھ میں مولوی صاحب کی جو بڑی بہن رہتی تھیں وہ عبداللہ کی پھوپھی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منہ بولی ماں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے مجھ جاتے ہوئے ان کے نام خط اپنے گھر والوں کے ہاتھ ہی بھیج دیا تھا۔ واپسی پر وہ بھی ایمان لوگوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ان کے سامنے ایمان کے رشتے کی بات رکھی تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ کا نام ہی تجویز کر دیا بلکہ بڑی بہن ہونے کے ناطے انہوں نے مولوی صاحب سے بطورِ حق ایمان کا رشتہ مانگا

www.Paksociety.com

شاید مولوی صاحب کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں اندر یہی خواہش پل رہی تھی، تبھی انہوں نے رات بھر سوچنے کے بعد ہاں کر دی۔ لیکن عبداللہ۔۔۔۔ عبداللہ سے کیا کسی نے اس کی رائے نہیں پوچھی۔۔۔؟ اس نے کیوں ہاں کر دی۔۔۔؟ لیکن وہ کیوں ہاں نہ کرتا۔۔۔۔ اس نے ایمان کے لیے میری دیوانگی ہی تو دیکھی تھی۔۔۔۔ اس پردہ نشین نے تو مجھ پر کھل کر آج تک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا اس تمام قصے میں کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔۔ میرا ذہن خود ہی سوال کر رہا تھا اور پھر خود ہی ان کے جواب بھی تلاش کر لیتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہیں بیٹھا اپنی قسمت کو روتا رہا۔۔۔۔

نہ جانے شاکر کو اس دن اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ مجھے باہر تانگے میں بیٹھے خیرو کا بھی خیال تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اس لیے نگہت کے بے حد اصرار کے باوجود مَیں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا، چلتے چلتے نگہت نے مجھ سے پوچھا کہ اَب کیا کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ انسان ہزار دشمنوں سے لڑ سکتا ہے لیکن جب اس کی تقدیر ہی اس کی دشمن بن جائے تو پھر اس سے مقابلہ کون کرے۔ میری تقدیر کا وار بھی جانے کب سے میرے درپے تھا۔ اس جیسے اور نہ جانے کتنے حادثے ابھی میرے تعاقب میں تھے۔ مَیں نگہت کو جھوٹی تسلی دے کر گھر سے نکل آیا۔ خیرو نے مجھے دیکھتے ہی تانگے کو ایڑھ لگائی اور ہم دوبارہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے خیرو کی سب سے اچھی عادت یہی لگی تھی کہ وہ از خود کبھی سوال کر کے دوسروں کی تنہائی میں مخل نہیں ہوتا تھا۔ چپ رہ کر اس بات کو کھلنے کا انتظار کرتا تھا۔ خاموشی بھی تو بہت بڑا صبر ہوتی ہے۔ اور خیرو اس معاملے میں بہت صابر تھا۔

مجھے اسٹیشن کے دروازے پر اُتار کر وہ اپنا تانگہ اسٹینڈ میں کھڑا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں لٹا پٹا سا چلتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ اسٹیشن ویران سا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ لیکن اس رات کی تنہائی اور اس رات کے درد کا بیان ہی کچھ مختلف کچھ سوا تھا۔

صبح مَیں دوبارہ شاکر کی جانب جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں غفورے کی آواز آئی۔

''وہ رہے حماد باؤ۔۔۔۔''

میں اس وقت صبح کی گاڑی میں سے مال اُتروانے کی تیاری میں تھا۔ اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بنے گارڈ روم کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ عبداللہ تھا۔۔۔ جو میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں مَیں عبداللہ سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے مَیں اس نوجوان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ تو یہ تھا وہ خوش نصیب جس کے نام میری ایمان کا قرعہ نکلا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔۔۔۔ میں تو اُسے اپنا رقیب بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرا رقیب ہی تو تھا۔ عبداللہ کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی اپنے لفظ بھول گئے تھے شاید، پھر مجھے ہی رسم ادا کرنی پڑی۔

''کیسے ہو۔۔۔؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔؟ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔۔۔۔ ''جی۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔۔ مَیں۔۔۔۔ میں آپ سے یہاں معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''میں اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔''

''میں پہلے صبح شاکر صاحب کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رات آپ وہاں آئے تھے۔۔۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ آپ کی تلاش میں یہاں آ چکا ہوں۔''

''ہاں۔۔۔۔ مجھے خبر مل گئی، نیا رشتہ مبارک ہو۔''

شاید شدید کوشش کے باوجود بھی مَیں اپنے لہجے کی تلخی نہیں چھپا سکا۔ عبداللہ نے تڑپ کر سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں اِک عجیب سی شکایت تھی۔ مجھے اپنے الفاظ کے چناؤ پر شرمندگی ہونے لگی۔

''آپ کو حق ہے۔۔۔۔ جو چاہے کہہ لیں۔۔۔۔ شاید مَیں آپ کو کبھی اپنا سینہ چیر کر اپنے دل کی حالت نہ دکھا پاؤں۔''

''میرا مقصد تمھارا دل دکھانا نہیں تھا۔ شاید کبھی کبھی لفظ اپنے معنی خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا ان کو ادا کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔''

عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''یہ بھی آپ ہی کا ظرف ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی معذرت کر رہے ہیں۔

www.Paksociety.com

مَیں بچپن سے مولوی صاحب کے اس قدر احسانوں تلے دبا ہوا ہوں کہ اگر مَیں ان کا شمار بھی کرنا چاہوں تو کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے چچا بن کر نہیں۔۔۔ بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر پالا ہے۔۔۔۔ خود تکلیفیں اُٹھائیں لیکن مجھ پر کبھی کوئی سخت وقت نہیں آنے دیا۔ ان کے اپنے ہاتھ چھل گئے پر انہوں نے کبھی میرے پیروں میں کوئی چھالا نہیں بننے دیا۔"

"تو کیا تمھارے اِقرار کی وجہ بھی صرف اُن کے احسانوں کا بوجھ ہی تھا۔" عبداللہ نے پھر اسی کرچی کرچی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"اس وقت اُن کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سی ٹھیس بھی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ جب انہوں نے پھپھو اور تمام گھر والوں سے چھپ کر اکیلے کمرے میں میرے سامنے اپنے سر کی دستار ڈال دی تھی تو مَیں نے اپنی زبان کو بالکل گنگ پایا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں آپ کی ایمان کے لیے دیوانگی سے واقف ہوں۔۔۔۔ شاید اسی لیے انہیں اپنی عزت کو یوں میرے سامنے گروی رکھنا پڑا۔ حالانکہ ان کی ہمیشہ سے یہی مرضی تھی شاید۔۔۔۔ لیکن آپ کے درمیان میں آ جانے سے وہ بہت ڈر گئے تھے۔۔۔ وہ اس بات سے بھی بے حد خوفزدہ تھے کہ ایمان کے کسی دوسرے گھر میں رشتے کے بعد کہیں کسی مقام پر آپ اپنی دیوانگی کے ہاتھوں اگر اس کے سسرال والوں کے سامنے آ گئے یا اگر بات ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے کھل گئی تو ان کی عزیز از جان بیٹی کی زندگی پل میں برباد ہو جائے گی۔۔۔۔

۔۔۔۔ ان سب باتوں کے پس منظر کو اور اپنے ایک ایسے محسن کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟"

عبداللہ میرے سامنے سرتاپا سوال بنا کھڑا تھا۔ مَیں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مَیں بھی وہی کرتا۔۔۔۔ جو تم نے اس وقت کیا۔"

عبداللہ کے اکڑے ہوئے بدن میں جنبش سی ہوئی اور اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"مَیں نے کہا تھا نا۔۔۔۔ یہ صرف آپ کے ظرف کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور

سچ کا اقرار کرنا چاہتا ہوں آج آپ کے سامنے۔۔۔ مَیں بچپن ہی سے جانتا تھا کہ میری شادی ایمان کے ساتھ ہی ہوگی۔ چچا کی نظر میں ہمیشہ سے میرے لیے وہ خاص پسند موجود رہی ہے جو کسی بھی باپ کی آنکھ میں اپنے ہونے والے فرزند کے لیے ہو سکتی ہے۔ جب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا تو میری پہلی نظر بھی ایمان کی طرف ہی اٹھی تھی۔ اور اس پہلی نظر سے لے کر آج تک مَیں ایمان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ محبت کی شدت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود کبھی محبت کی ہو۔ لیکن آج تک کبھی اس محبت کے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے اظہار کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ ایمان تو ہمیشہ سے ہی میرے نام لکھی جا چکی تھی۔ سوچا کہ شادی کے بعد پہلی رات اُسے اپنی زندگی بھر کی بے تابیوں کی کہانی سناؤں گا۔۔۔۔ اُسے ایک ایک بات یاد دلا کر بتاؤں گا کہ تب میرا اس کی کتاب میں مور کے پر رکھ دینے کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے جان بوجھ کر اس سے پانی کیوں مانگتا تھا۔ اپنے استری شدہ کپڑے پھر سے اُسے استری کرنے کے لیے کیوں دے دیتا تھا۔ شدید سردیوں کی رات میں چچا سے چھپ کر اس کے لیے اتنی دُور سے پان کیوں لاتا تھا۔"

عبداللہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں اور میرے دماغ میں جیسے آندھیوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا۔۔۔۔ تو ایک مرتبہ پھر محبت ہی تھی جو اس نوجوان کو ہمیشہ بھیڑ میں بھی سب سے الگ دکھاتی تھی۔ عبداللہ کی بات جاری تھی۔

"لیکن پھر آپ آ گئے، مَیں جانتا ہوں کہ ایمان نے آج تک پلٹ کر آپ کو کوئی جواب نہیں دیا ہوگا۔ کوئی اُمید نہیں دلائی ہوگی کیونکہ مَیں اس لڑکی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ شرم و حیا اور رواداری کی جس مٹی سے گوندھ کر خدا نے اُسے بنایا ہے۔ اس میں شاید ایسی محبت کی آمیزش ہی نہیں رکھی گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد مولوی صاحب کی خوشی ہے اور وہ اس خوشی کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک پل کی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی تو کیا۔۔۔۔ اپنا ایمان تک تیاگ سکتی ہے۔۔۔۔۔

لیکن جانے کیوں۔۔۔۔ آپ مجھے باقی سب سے مختلف لگے۔ مجھے دھیرے دھیرے ایسا لگنے لگا کہ آپ مولوی صاحب کے دل میں گھر کر ہی لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں چچا آپ کے سامنے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔۔۔۔

www.Paksociety.com

میری خودغرض سوچیں تنہائی میں مجھے رلاتی تھیں کہ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہوگا۔ آپ کی محبت کی طاقت سے مَیں بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی محبت ایک ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا کر لے جا سکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود مَیں کبھی آپ کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکا، کبھی آپ سے دل میں بھی نفرت نہیں کر سکا۔ شاید یہ بھی آپ کی محبت کا ہی کمال ہوگا۔"

لیکن پھر جس دن مَیں نے آپ کو اس اسٹیشن پر ریلوے قلی کے روپ میں دیکھا اس دن میرا دل بھی آپ کے سامنے ہار مان گیا۔ آپ سے جیتنا مجھ جیسے کمزور شخص کے بس کی بات ہی نہیں۔ میری محبت نے اسی دن آپ کی محبت کی عظمت کو سجدہ کر دیا تھا۔۔۔۔ افسوس ۔۔۔۔ چچا اس محبت کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔۔ وہ ایک ڈرے ہوئے مجبور باپ ہیں۔ اور ان کی تربیت اور ماحول میں ایسی کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ مَیں یہاں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے آپ کی، آپ کی عظیم محبت کی قدر نہیں کی۔۔۔۔ آپ ہم سب کو معاف کر دیں۔۔۔۔ معاف کر دیں۔"

عبداللہ کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔ مَیں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ جوانِ رعنا آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے، اپنے ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُسے اپنے گلے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔ ہم دونوں کے پاس مزید کچھ کہنے کو تھا بھی نہیں۔ بس یہ آنسوؤں کی بولی ہی تھی جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھا سکتی تھی۔

کتنا عجیب منظر تھا، دُنیا نے آج تک رقیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرتے، لڑتے اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔۔۔۔ یہ کیسے دو رقیب تھے جو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔۔۔۔ ان میں سے ایک سب کچھ پا کر رو رہا تھا تو دوسرا سب کچھ لٹا کر۔۔۔۔

اس کے بعد عبداللہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے لمحہ بھر کے لیے میرے ہاتھ پکڑے، انہیں اپنی بھیگی آنکھوں سے لگایا اور پلٹ کر وہاں سے چل دیا۔ مَیں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دُنیا میں اتنے ہمت والے لوگ مَیں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

وہ آیا، اس نے کس دیدہ دلیری سے اپنا سچ مجھے بتایا اور واپس چلا گیا۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں ہی اپنی عمر گنوا دیتے ہیں۔ اس سے کہیں چھوٹا سچ بولتے ہوئے ہماری زبانیں سالہا سال پھسلتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ سچ ہمارے منہ سے نکل نہیں پاتا۔ جھوٹ در جھوٹ کی تہیں ہمارے ضمیر کو ڈھانپتی رہتی ہیں اور آخر کار ہم سچ بولنا ہی بھول جاتے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔ سچ بولنا صرف محبت کرنے والوں کا ہی شیوہ ہے۔ کیونکہ شاید دُنیا میں صرف محبت ہی سچ ہے۔ باقی سارے جذبے کسی نہ کسی منافقت کی پیداوار ہیں۔

اگر عبداللہ میرے سامنے ایمان سے اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا تو مجھے ساری زندگی اس کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اُسے کوئی اور مجبوری تھی کہ وہ میرے سامنے یہ راز کھولتا۔ لیکن یہ اس نوجوان کے اندر کا سچ تھا جس نے اُسے یہاں مجھ نامُراد تک چل کر آنے پر مجبور کیا۔ عبداللہ اپنا سچ بول کر چلا گیا تھا، جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے بھیانک سچ تنہا جھیلنے تھے اور ان میں سب سے زیادہ تلخ سچ یہ تھا کہ ایمان اَب کسی اور کے نام سے منسوب ہو چکی تھی۔

OO

www.Paksociety.com

جادوگر

ربیکا نے جم کے میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد میرا نام جادوگر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جادوگری میری شخصیت کا حصہ بنانے والی دُور میرے دیس کی ایک گل فام ہے، جو مجھے جینے کا ہر قاعدہ سکھا گئی ہے۔

اس دن بھی وہ کلاس میں بیٹھی میرے کان کھا رہی تھی۔

''نہیں ۔۔۔۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو۔ سارہ جیسی لڑکی نے تمھارے لیے باپ سے جھگڑ کر گواہی دے دی۔ جم جیسا مغرور اور بدتمیز امیر زادہ خود تمھارے پاس چل کر دوستی کے لیے آ گیا۔ یہ سب جادو نہیں تو کیا ہے ۔۔۔۔؟ مجھے بھی سکھا دو نا یہ سب کچھ۔''

''میں نے ایسی کوئی انہونی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے تم اتنی حیران ہو رہی ہو۔ میں، تم، سارہ اور جم ۔۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں، بس انسان کو اِک ذرا سا انسان ہی کی طرح سمجھنے کی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔''

''یہی تو سب سے مشکل کام ہے مائی ڈیئر میڈی ۔۔۔۔ انسان کو سمجھنا ہی تو محال ہے۔ لیکن تمھارے ساتھ رہوں گی تو یہ بھی سیکھ لوں گی۔''

اتنے میں ربیکا کو اس کی کسی سہیلی نے آواز دے دی اور مجھے نہر کنارے کھڑے جوزف کا پیغام آ گیا۔ آج وہ پھر مصوّری کے موڈ میں تھا۔ آج لندن میں چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اس چیز کا فائدہ اُٹھانے کے لیے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے غائب باہر گھاس کے میدانوں میں آڑھے ترچھے پڑے نظر آ رہے تھے۔ سچ ہے لندن میں رہ کر مجھے بھی دھوپ کی اس نایابی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ جوزف نے تصویر ابھی مکمل نہیں کی تھی لیکن مجھے اس نے اپنی تصویر کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑی سارہ کی پینٹنگ دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ سارہ اپنے دمکتے رنگ پر دھوپ کی گرمی جھیلتی ہوئی گہرے نیلے سکرٹ میں آسمانی رنگ کی سویٹر پہنے دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تصویر مکمل کر رہی تھی۔ جوزف مجھے اس کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مَیں سارہ کو اور اس کی تصویر کو آخری اسٹروک دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سارہ نے تصویر مکمل کر کے میری طرف رائے طلب نظروں سے دیکھا۔

''بہت اچھی ہے ۔۔۔۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی ۔۔۔۔ ایک تشنگی ۔۔۔۔ ایک نامکمل پن کا احساس ہو رہا ہے تمھاری تصویر کو دیکھ کر۔''

''بہت خوب ۔۔۔۔ گویا رنگوں کی زبان بھی جانتے ہو۔ ٹھیک کیا تم نے ۔۔۔۔ میری ہر تصویر میں تمھیں اس نامکمل پنے کا احساس ملے گا۔ لیکن سر جوزف کے بعد تم پہلے انسان ہو جسے اس کمی کا احساس ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، مَیں تصویر مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہوں۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھاری ہر تصویر کا موضوع کوئی تلاش، کوئی کھوج ہوتی ہے۔ اور شاید وہ کھوج پوری ہونے سے قبل ہی تم ہمت ہار دیتی ہو؟''

سارہ نے اُلجھ کر میری طرف دیکھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے بھلا کس چیز کی کھوج ہو سکتی ہے۔''

''سچ کی کھوج۔''

''سچ ۔۔۔۔ سچ کو کھوج کی بھلا کیا ضرورت ۔۔۔۔ وہ تو سامنے ہی روشن اور عیاں ہوتا ہے، تم یہ بتاؤ تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔''

''ابھی درمیان میں ہوں، لیکن اس ٹرم پیپر کی وجہ سے بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ سر آئزک کی طرف تھا۔ سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔''

''اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو تم سے ڈر نہیں لگتا۔''

''مَیں نے کہا نا ۔۔۔۔ تم سچی لڑکی ہو ۔۔۔۔ اور سچ کو اُجالے کا خوف کیسا؟''

www.Paksociety.com

سارہ زور سے ہنسی۔

''مَیں نے بھی کہا تھا نا۔۔۔۔تم واقعی بہت خطرناک ہو، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''

مَیں بھی ہنس پڑا۔

''بے فکر رہو، تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ویسے تم نے جم کو معاف کر کے اس کا دل ہی پلٹ دیا ہے، کل تک جو تمھارا جانی دشمن تھا، آج سارا دن تمھاری خوبیوں کے گن گاتا رہتا ہے۔''

''مَیں یہاں دشمنیاں پالنے تو کبھی نہیں آیا تھا، مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھارے اور سر آئزک کے درمیان تلخی پیدا ہوئی۔''

سارہ نے سر پیٹ لیا۔

''اف۔۔۔۔یہ ربیکا بھی نا۔۔۔۔اس کے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہیں رہ سکتی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا اور میرے درمیان ایسی نوک جھونک چلتی ہی رہتی ہے۔ انہیں دراصل اس بات کا بُرا لگا تھا کہ تیس سال میں آج تک یونیورسٹی میں کسی نے ان کے فیصلے کے خلاف سَر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن مَیں نے ان سے کہا کہ ہر نئے کام کی ایک دن ابتداء ہونی ہی ہوتی ہے۔ وہ مزید بگڑ گئے اور پھر مجبوراً مما کو بیچ میں کودنا پڑا۔ پھر حسب معمول پاپا کو ہار ماننا ہی پڑی۔''

''لگتا ہے تمھیں اپنی مما سے بہت پیار ہے۔''

سارہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''اوہ ہاں۔۔۔۔میری مما ہی تو میری جان ہیں۔ پاپا تو ہمیشہ مجھے بیٹوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات لگاتے ہیں لیکن مما ہمیشہ میری مرضی کو ترجیح دیتی ہیں، وہی میرے دل کی حالت سب سے بہتر جانتی ہیں۔''

سارہ کی اس کی ماں سے محبت اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

''اب تو وہ تمھارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔ کبھی ملواؤں گی تمھیں ان سے۔''

''ضرور۔۔۔۔مَیں ایسی خاتون سے ضرور ملنا پسند کروں گا جو بیک وقت سر آئزک اور تمھارے دل پر راج کرتی ہیں۔''

میری تعریف کے انداز پر سارہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''مَیں مما کو تمھاری یہ بات ضرور بتاؤں گی۔''

مَیں اور سارہ اس روز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس بات سے بے خبر کہ دُور کہیں دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے کوئی شخص بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔۔۔۔اور یہ شخص کوئی اور نہیں تھا۔ میرے ساتھ کھڑی اس صاف دل لڑکی کا باپ آئزک تھا۔ جس کا دل اَب میری طرف سے اتنا صاف نہیں تھا۔

ٹرم پیپر جمع کروانے کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے دن اور رات کا بیشتر حصہ ''ہالوکاسٹ'' سے متعلق ریسرچ کی کتابوں کی ورق گردانی اور نوٹس بنانے میں گزر رہا تھا۔ اس دن بھی مَیں لائبریری میں سہ پہر دیر تک اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا رہا۔ مجھے دراصل اپنی یونیورسٹی سے ''ہالوکاسٹ'' کے حق میں ہی مواد مل سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی میرے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ مجھے ہالوکاسٹ کے حق میں اور اس کے مخالف نظریے میں مقابلہ کر کے حقائق جاننے کا مزید موقع میسر آ گیا تھا۔ اب مَیں دلیل در دلیل بحث کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی کے گیٹ سے نکلتے ہوئے مجھے سارہ کی سفید بیٹل نے کراس کیا۔ گاڑی آگے جا کر رک گئی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ سارہ کے ساتھ ایک میٹھی سی مسکراہٹ والی پکی عمر کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے گاڑی تک چل کر آنے کے وقت میں شاید سارہ اُسے میرے بارے میں کچھ بتا چکی تھی۔ عورت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''اچھا تو یہ ہے تمھاری کلاس کا باغی۔۔۔۔بھئی یہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔'' سارہ مسکرائی۔

''حماد۔۔۔۔یہ میری مما ہیں، مسز جینی آئزک۔''

مَیں نے سر جھکا کر مسز جینی کو آداب کیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، سارہ بولی۔

''کہاں جا رہے ہو، آؤ مَیں تمھیں چھوڑ دوں گی۔''

www.Paksociety.com

''ہاں ہاں ۔۔۔۔آ جاؤ۔۔۔۔راستے میں گپ شپ بھی رہے گی۔'' مسز جینی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں۔۔۔۔مَیں یہاں قریب ہی پینو راما اسکوائر کے قریب والی لائبریری تک جا رہا ہوں۔بس اگلے سگنل کے پاس ہی ہے، آپ لوگ جائیں۔''

''نہیں بھئی، اتنی آسانی سے تو ہم تمھیں نہیں جانے دیں گے۔'' مسز جینی ہنس کر بولیں۔اگر آج رات ہماری طرف کھانے پر آنے کا وعدہ کرو تو جان چُھوٹے گی۔''

سارہ نے بھی سر ہلایا، اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا میرے پاس۔مَیں نے ان سے وعدہ کیا کہ مَیں رات کو ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

OO

دشمنِ خدائی

اس دن عبداللہ کے واپس جانے کے بعد جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ایک دم سے ہی جانے کیوں مجھے ساری خدائی ہی دشمن لگنے لگی تھی۔ایک دم ہی میرا دل جیسے ہر اچھے احساس سے عاری ہو گیا تھا۔مَیں جس دن سے صوفی رحمت اللہ سے ملا تھا تب سے اس دن عبداللہ کی مجھ سے اسٹیشن پر ملاقات ہونے تک، میری ایک بھی نماز نہیں چھوٹی تھی۔لیکن اس دن عبداللہ کے واپس چلے جانے کے بعد میرا دل مذہب سے بالکل ہٹ گیا تھا۔جیسے میرے اندر کا یقین ہی بالکل ختم ہو گیا تھا۔دُعا اور اس کی قبولیت سے میرا بھروسہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب ایک ڈھکوسلہ لگنے لگا تھا، میری ساری نمازیں چھوٹنے لگی تھیں۔مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ یہ نمازیں، یہ دُعائیں سب بے فائدہ ہیں۔اگر ان نمازوں سے ان دُعاؤں سے کچھ فرق پڑنا ہوتا تو خدا مولوی صاحب کا دل میرے لیے نرم کر دیتا۔ آج ایمان عبداللہ سے منسوب ہونے کی بجائے مجھ سے منسوب ہوتی۔

مجھے مولوی صاحب کی ہر بات بھی صرف ایک ڈھونگ لگنے لگی تھی، مجھے لگتا تھا کہ وہ شخص سر سے پیر تک صرف ایک دکھاوا ہی تو ہے، جو زمانے کے سامنے اپنی پارسائی کا سوانگ رچانے کے لیے میری محبت کے درپے ہے۔اسے صرف یہ فکر ہے کہ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدیوں اور نمازیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔جو صرف یہ چاہتا ہے کہ آتے جاتے اور اُسے بازاروں سے گزرتے دیکھ کر لوگ اس کی تعظیم کے لیے اُٹھ اُٹھ کر اسے سلام کرتے رہیں اور اس کے گزر جانے کے بعد اُونچی سرگوشیوں میں اس کی نیکیوں اور پاک بازی کے گُن گاتے رہیں۔جنھیں سُن کر وہ اپنی عظمت کے نشے میں خود ہی ہمہ وقت سرشار رہے۔

ایسے اور اس جیسے جانے کتنے خیالات دن رات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے

www.Paksociety.com

تھے۔شاید مجھ سے یہ توفیق ہی چھین لی گئی تھی کہ مَیں کوئی مثبت بات سوچ سکوں۔مولوی صاحب کے پاس جب مَیں عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو نماز کے بعد کے درس میں عجیب و غریب قسم کے مسائل سننے کو ملتے تھے۔مثلاً ایک دن نماز کے بعد ایک نوجوان مولوی صاحب کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ ایک انوکھا مسئلہ ہے۔اور وہ یہ کہ جب وہ گھر سے کہیں دُور کسی کام کے لیے نکلتا ہے، یا پھر جب وہ دوسرے شہر پڑھنے کے لیے جاتا ہے اور اُسے بورڈنگ میں رہنا پڑتا ہے تو اس سے ساری نمازیں چھوٹ جاتی ہیں۔وہ چاہ کر بھی نماز نہیں پڑھ پاتا کیوں کہ نماز پڑھنے سے اُسے گھر کی یاد اور زیادہ ستاتی ہے؟ اُسے لگتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھے گا تو اور زیادہ غمگین ہو جائے گا، لہٰذا وہ نماز پڑھنے کے بجائے ان اوقات میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے اور فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب تشریف لائے جو اُس بات سے بے حد پریشان تھے کہ ان کا دل حج پر جانے کو نہیں مانتا۔حالانکہ وہ صاحبِ استطاعت ہونے کے ساتھ ساتھ تندرست بھی تھے اور ان پر کوئی ایسی ذمہ داری بھی نہیں تھی کہ وہ خود اور اپنی بیگم کو لے کر حج کے لیے نہ نکل پاتے۔لیکن بقول ان کے، ان کا دل ہی اس طرف مائل نہیں ہو پاتا تھا۔ انہیں حج پر جانا ایک بڑی خواری کا کام لگتا تھا، اور جو محبت خدا کے گھر کو دیکھنے کے لیے دل میں ہونی چاہیے تھی، وہ اس محبت سے بالکل عاری تھے۔

ان دنوں میں بڑی حیرت سے لوگوں کے یہ مسئلے سنا کرتا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مولوی صاحب کے جواب ہوتے تھے۔مثلاً ان حج والے صاحب کو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ساری بات توفیق ملنے کی ہے۔فی الحال ان کے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ کم از کم اس بات پر پریشان تو ہوتے ہیں کہ انہیں حج سے رغبت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔فی الحال انہیں پریشان ہونے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔جس دن حج پر جانے کی توفیق نصیب ہوگی، وہاں جانے کی محبت اور عجلت خود بخود دل میں پیدا ہو جائے گی۔ہاں البتہ دُعا ضرور کرتے رہیں کیونکہ پریشانی کی بات تب ہوگی جب دل سے حج نہ کرنے کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔ایک دن اسی طرح دُعا کے متعلق ایک عجیب بات سننے کو ملی۔ایک نوجوان مولوی صاحب کے سامنے پریشان حال بیٹھا اس بات کا رونا رو رہا تھا

کہ اس کی دُعا میں خلوص شامل نہیں ہوتا۔وہ بس برائے نام ہی خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ نہ ہی اس کی توبہ اور معافی میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔وہ منافقانہ انداز میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی تو مانگ لیتا ہے لیکن اندر سے اُسے اِس گناہ پر خوشی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر کبھی دوبارہ موقع ملا تو وہ یہ گناہ ضرور دوبارہ بھی بنا کسی حجت اور ندامت کے کر گزرے گا۔

مولوی صاحب نے اُسے بھی جواب میں یہی بات کہی۔''توفیق۔'' اسے بھی یہی دلاسا دیا گیا کہ ابھی کچی اور منافقانہ معافی کی توفیق ملی ہے۔پُرخلوص معافی کی بھی وقت آنے پر مل جائے گی۔شرط صرف اتنی سی ہے کہ اس منافقانہ اور دکھاوے کی معافی کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ندامت چاہے دکھاوے کی ہو یا چاہے منافقانہ اُسے پیش کر دینا چاہیے۔

اسی لیے مجھے بھی لگ رہا تھا کہ مجھ سے ہر اچھی بات سوچنے کی اور ہر نیک کام کرنے کی توفیق بھی شاید عبداللہ سے ہوئی اس ملاقات کے ساتھ ہی چھین لی گئی تھی۔مَیں سارا سارا دن یونہی خالی الذہن بیٹھا رہتا اور اپنے سامنے ہونے والے دُنیا کے تماشے کو دیکھتا رہتا تھا۔

اب مَیں نے شاکر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔خیرو اور غفورے سے بھی کم ہی بات چیت ہوتی تھی۔صدیقی صاحب بھی میری راہ تکتے رہتے تھے اور پھر انتظار سے اکتا کر خود ہی اسٹیشن پر چلے آتے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔کبھی یہ جانتے تھے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے لیکن میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔خیرو روزانہ اِس اُمید پر صبح و شام تانگہ جوت کر میرا اسٹیشن کے باہر انتظار کرتا رہتا کہ شاید مجھے اپنی منت پر جانا ہو، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میری ہر منت دم توڑ گئی تھی۔ایمان کو مانگنے کے بعد میرے پاس مانگنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔نہ ہی کسی مُراد کے پورے ہونے کا یقین ہی دل میں باقی بچا تھا۔مَیں دُنیا کی ہر خوشی اور ہر غم سے لاتعلق ہو گیا تھا۔مَیں ایمان کی قریب آتی ہوئی شادی کے دن یوں گن رہا تھا جیسے کوئی پھانسی کا قیدی کال کوٹھڑی میں اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے۔

وہ ایک ایسا ہی دن تھا، بوجھل، بے نُور، انتہائی طویل اور اُکتا دینے والا۔مَیں سہ پہر

www.Paksociety.com

کو پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی لگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے پچھلے پھاٹک پر بہت دیر سے رُکی ہوئی تھی۔ تھک کر مَیں لیمپ پوسٹ کے نیچے بڑے تھڑے پر بیٹھ گیا اور جس طرف سے مال گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہونا تھا اس طرف کے سگنل کو دیکھنے لگا۔ آج غفورا بھی نہیں تھا اور تمام مال مجھے ہی اتروانا تھا، دفعتاً میری نظر سگنل سے ہوتی ہوئی نیچے پٹریاں کراس کر کے پلیٹ نمبر 2 کی طرف آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔ پر کون تھا یہ آدمی۔ اچانک مَیں اپنے حواس میں ایک جھٹکے سے لوٹ آیا۔ ارے ۔۔۔۔ یہ تو شاکر تھا، اپنی مخصوص ڈرائیوروں والی سفید وردی میں، جس کی وجہ سے مَیں دُور سے اُسے ریلوے کا ہی کوئی اہلکار سمجھ بیٹھا تھا۔ شاکر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ مَیں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکر نے قریب آتے ہی مجھے زور سے بھینچ لیا اور بہت دیر تک بنا کچھ کہے چُپ چاپ مجھے گلے لگائے کھڑا رہا اور جب مجھ سے علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''حماد بابا۔۔۔۔ کیا میرا گھر اس قابل بھی نہیں تھا کہ آپ وہاں کچھ دن رہ سکتے۔''

''تم جانتے ہو ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔ وہ میرا دوسرا گھر ہے۔۔۔۔ لیکن اگر گھر میں ہی رہنا ہوتا تو پھر پہلا گھر ہی کیوں چھوڑتا۔۔۔۔؟ لیکن تمھیں یہاں کا پتہ کس نے دیا۔۔۔

''مَیں جانتا تھا نگہت زیادہ دن تک یہ بات چھپا نہیں پائے گی۔''

''مَیں چاہتا تو آپ کو گھر سے نکلنے کے بعد پہلے دن ہی تلاش کر لیتا بابا۔۔۔۔ لیکن مَیں نے صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ آپ بُرا مان جائیں گے۔ آج بھی واقعی مَیں نگہت کے بتانے پر ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس نے آپ کو ابھی گھر بلایا ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔''

''ابھی۔۔۔۔ لیکن مجھے اس وقت بہت کام ہے۔۔۔۔ مَیں شام کو۔''

''نہیں بابا۔۔۔۔ آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ اگر جلدی نہ ہوتی تو نگہت مجھے کبھی آپ کا پتہ نہ دیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا کتنا مان رکھتی ہے۔''

شاکر کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے مال گاڑی کا معاملہ ایک دوسرے سینئر قلی کے ہاتھوں میں سونپ کر اس کے ساتھ اسٹیشن سے نکلنا ہی پڑا۔ باہر ایک پُرانی اوپل کھڑی

تھی۔ شاکر جانتا تھا کہ مَیں کمشنر صاحب یا گھر کی کسی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے وہ شاید کسی جاننے والی کی کار لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں پُرانی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں شاکر نے بتایا کہ امی اب اندر سے ٹوٹ چکی ہیں اور میری تلاش میں عباد کو ہر طرف دوڑا چکی ہیں۔ لیکن کمشنر صاحب کے ڈر سے کوئی کھلے عام میری جدائی کا ذکر گھر میں نہیں کرتا۔ اب وہ سب ہی جان چکے ہیں کہ مَیں اپنے کسی دوست کی طرف نہیں گیا تھا اور گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی تنہا کہیں رہ رہا تھا۔ امی نے شاکر سے بھی مجھے تلاش کرنے کو کہا تھا اور آخر کار شاکر کو ان کی تسلی کے لیے انہیں بتانا پڑا تھا کہ مَیں کبھی کبھار پُرانی حویلی میں نگہت اور شاکر سے ملنے کے لیے آتا رہا ہوں اور خیریت سے ہوں۔ امی نے شاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ اب اگر کبھی مَیں پُرانی حویلی آؤں تو شاکر چپکے سے امی یا عباد کو اطلاع کر دے۔ مَیں نے چونک کر شاکر کی طرف دیکھا۔ کہیں میرا بلاوہ اسی پروگرام کا ہی تو کوئی حصہ نہیں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی کو ملامت کی۔ شاکر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ورنہ وہ مجھے یہ سب تفصیل بتاتا ہی کیوں؟

کچھ ہی دیر میں ہم پُرانی حویلی کے پھاٹک نما گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ شاکر نے مجھے گیٹ پر اُتارا اور مجھے گاڑی واپس کر کے جلد آنے کا کہہ کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام کے ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ حویلی پر اک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ سے اندر گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر نگہت پر پڑی جو بے چینی سے حویلی کے بغلی دالان میں ٹہل رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

''اوہ بھیا۔۔۔۔ کہاں رہ گئے تھے آپ۔۔۔۔ کتنے دن سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں مجبوراً مجھے آج ابا کو آپ کے پیچھے بھیجنا پڑا۔ کیا آپ نے ہم سب سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔۔۔۔ تبھی آپ مجھ سے بھی ملنے نہیں آئے نا۔''

نگہت کی آنکھوں میں شکوہ تھا، مَیں نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی۔

''بڑی چالاک ہو۔۔۔۔ جانتی ہو کہ میرا پتہ بتانے پر ڈانٹ پڑے گی مجھ سے اس لیے پہلے ہی سے تیاری کر رکھی ہے مجھ سے ناراض ہونے کی۔۔۔ ہاں؟''

''بات ہی ایسی تھی۔۔۔۔ ورنہ میں آپ کا پتہ کبھی کسی کو نہ دیتی۔ دراصل حیا آپ

www.Paksociety.com

سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکی ہے۔ لیکن تب بھی آپ کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔ مَیں نے اُسے تب یہ کہا تھا کہ شاید آپ ایک آدھ دن میں آئیں گے تو مَیں آپ کو آج کے دن دوبارہ آنے کا کہوں گی۔ تب وہ بھی آ جائے اور آپ سے بات کر لے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور آپ مجھ سے ملنے آئے ہی نہیں اور آج کا دن بھی آ گیا جب مَیں نے حیا کو یہاں دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ بس اسی پریشانی میں ابا کو آپ کی طرف بھیجنا پڑا۔"

میرے لیے حیا کی آمد واقعی بہت حیرانی کا باعث تھی۔ وہ نازک سی لڑکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اُسے دو مرتبہ اپنے قفس جیسے گھر سے نکل کر اتنی دُور تک یہاں آنا پڑا تھا۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر سے نکلنا حیا کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہوگا۔

"کہاں ہے حیا۔۔۔؟"

"مَیں نے اُسے حویلی کے بڑے برآمدے والے گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ مَیں اسی پریشانی میں یہاں ٹہل رہی تھی کہ اگر آپ ابا کو اسٹیشن پر نہ ملے تو مَیں حیا کو کیا جواب دُوں گی۔ آپ اس سے دو گھڑی وہیں مل لیں، مَیں ابھی آتی ہوں۔"

نگہت نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ میں گومگو کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر چلتے چلتے مجھے کچھ خیال آیا۔ مَیں نے جاتی ہوئی نگہت سے آواز دے کر پوچھا۔

"لیکن حیا یہاں تک اکیلی آئی کیسے۔۔۔؟"

"وہ اکیلی نہیں آئی، اُس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ اندر ہماری طرف اماں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔"

نگہت پلٹ کر چلی گئی، مَیں مزید اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ حیا اپنی امی کے ساتھ آئی ہے۔۔۔ تو کیا اس کی ماں کو بھی اس بات کی خبر ہے جو حیا مجھ سے کہنے کے لیے اتنی دُور آئی ہے؟

میں اسی شش و پنج میں مبتلا چلتا ہوا حویلی کے بڑے برآمدے تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے ہو کر مَیں نے اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی اور پھر مَیں قدم بڑھا

کر اندر داخل ہو گیا۔ حیا نے آہٹ سُن کر چونک کر مجھے اندر آتے دیکھا اور بوکھلاہٹ میں وہ کھڑی ہو گئی۔ جلدی میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ اس دن مَیں نے پہلی مرتبہ حیا کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایمان سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ شاید عمر میں دو تین سال ہی اُس سے چھوٹی ہو گی۔ اس کی پلکیں بھی ہر لمحہ ایمان کی پلکوں کی طرح لرزتی ہی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایمان کی طرح ہی بڑی سی چادر میں لپٹے سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی ان جانے جذبے کی طاقت سے یہاں تک تو آ گئی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ مجھے اس کی دلجوئی کے لیے خود ہی بات شروع کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید ہم دونوں ہی یوں خاموش کھڑے رہتے۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیے۔"

حیا چُپ چاپ بیٹھ گئی، مَیں بھی سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"معافی چاہتا ہوں آپ کو میری وجہ سے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی نگی نے بتایا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔"

حیا نے پلکیں اُٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔

"آپ اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔"

مجھے اس براہِ راست طرزِ تخاطب کی توقع نہیں تھی۔

"شاید میری قسمت میں ہی یہ سزا لکھ دی گئی تھی۔ اور پھر تقدیر سے کیا اُلجھنا۔۔۔؟"

"آپ جو محبت کر رہے ہیں وہ اب صرف کتابوں اور افسانوں میں باقی رہ گئی ہے۔۔۔ ایسی محبت کو سمجھنے والے اب اس دُنیا میں باقی نہیں ہیں۔"

مَیں نے حیرت سے اس نازک سی گل اندام لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اسکول، کالج سے واپس آئی ہوئی لگتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی بڑی بڑی باتوں کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ رکھتی ہیں۔

"محبت کرنا نہ کرنا اپنے اختیار میں ہی ہوتا تو پھر مسئلہ کس بات کا تھا۔ محبت کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی محبت کو اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ کوئی اسے سمجھے گا یا نہیں۔"

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔

''کاش آپ کا اور ایمان آپی کا میل ممکن ہوتا۔ لیکن ایک اس میل کے نہ ہونے سے آپ باقی ساری دُنیا کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ آپ کے لیے ایمان باجی کا یہی پیغام لائی ہوں مَیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ خدا کے لیے یوں در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ ان کی آپ سے آخری التجا ہے۔''

اوہ۔۔۔۔ تو حیا اُسی ماہ رُو کا پیغام لے کر آئی تھی۔ گویا اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا۔ شاید وہ اس دن اسٹیشن پر میری حالت کو ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ لوگ کتنے معصوم اور بھولے ہوتے ہیں۔ بھول جانے کا کہہ کر سمجھتے ہیں کہ دوسرا شاید سب بھول ہی جائے گا۔ چلو اس سنگ دل کو مجھ پر اتنا رحم تو آیا کہ اُس نے نامہ بر بھیج کر مجھے اپنا درد اور اپنی وحشت بھول جانے کا پیغام تو بھیجا۔ اس ایک جنم کے لیے تو اس کی یہ مہربانی بھی کچھ کم نہ تھی۔

''اگر آپ کی ایمان آپی کی تسلی اس بات سے ہوتی ہے کہ مَیں واپس اپنے رشتوں کے پاس چلا جاؤں تو آپ ان سے جا کر یہی کہہ دیجئے گا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اگلی ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزاریں کہ ان کی وجہ سے کوئی گھر سے بے گھر ہوا تھا۔''

حیا نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

''میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہنا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو آپی کے احساسات کا ہی خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟''

''پھر آپ ہی بتائیے۔۔۔۔ میں انہیں یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ اس دُنیا کے نہیں لگتے۔۔۔۔ یہ دنیا آپ جیسوں کے لیے بنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکے تو میری درخواست پر غور ضرور کیجئے گا۔ یہ صرف آپی کی ہی خواہش نہیں ہے۔ یہ میری بھی آپ سے یہی التجا ہے۔ اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر ہماری کیا حالت ہوئی تھی۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔۔ اس دن امی نے بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ انہیں بھی آپ

ساری دنیا سے الگ نظر آئے تھے۔ کاش ہماری بدنصیبی کے ستاروں کا سایہ آپ پر کبھی نہ پڑتا۔''

اتنے میں نگہت کمرے میں داخل ہوئی۔ حیا اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ نگہت نے اسے بتایا کہ اس کی امی جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ حیا نے مجھ سے رخصت لی اور جانے کے لیے پلٹی۔ میں گم سم سا بیٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک حیا رکی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں چھپا تہ کیا ہوا کاغذ کا رقعہ نکالا۔ اور میرے قریب آ کر اُسے میری طرف بڑھایا۔

''یہ آپی نے مجھے اس وقت آپ کو دینے کا کہا تھا جب مجھے لگے کہ میری درخواست آپ کی قبولیت پانے کے قابل نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔ حیا پلٹ کر چلی گئی اور ہاتھ میں سفید کاغذ کی وہ پرچی تھمی کی تھمی رہ گئی۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ نگہت بھی حیا کو چھوڑنے باہر چلی گئی تھی۔ مَیں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ محبوب کا خط کھولنے اور اُسے پڑھنے کی لذت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنھوں نے خود اس تجربے سے گزر کر دیکھا ہوتا ہے، وہ چند لمحے کسی قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتے، میرے لیے تو ویسے بھی یہ اس مہ جبیں کے پہلے چند لفظ تھے جو تحریر کی صورت میں اُس نے بھیجے تھے۔ ورنہ لوگ تو ہزاروں مرتبہ کے کہے، سنے اور پڑھے ہوئے لفظوں کو بھی کسی تبرک کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں دن میں ہزار ہزار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار انہیں وہ تحریر اتنی ہی نئی لگتی ہے جتنی پہلی مرتبہ لگی تھی۔ میری نظریں تیزی سے کاغذ پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ خوبصورت لکھائی میں صرف چند جملے ہی لکھے ہوئے تھے۔ بنا کسی القابات اور روایتی سلام و دُعا کے بغیر۔

''آپ کے ارادے اور اس کی سچائی کی عظمت پر شک نہیں ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔۔۔۔ ضد تو دشمنی کی پہچان ہے۔

آپ گھر واپس چلے جائیں اور یہ دشمنی ختم کر دیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری التجا ہے۔''

☆☆☆☆

www.Paksociety.com

شاید ان چند لمحوں میں مَیں نے بیسیوں بار اس رقعے کو پڑھا ہوگا۔ ہر دفعہ اس اُمید پر کہ شائد کوئی لفظ مجھ سے پچھلی مرتبہ چھوٹ گیا ہو۔ شائد مجھ سے پڑھنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ دراصل مَیں اب تک خود کو یقین ہی نہیں دلا پایا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اس گل رُخ کی تحریر ہے جو اس نے صرف میرے لیے لکھی ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔۔ حماد امجد رضا کے لیے۔۔۔۔ کیا زندگی مزید جینے کا اس سے بڑا کوئی اور بہانہ ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کاغذ کے ٹکڑے میں، ان لفظوں کی پور پور سے اور اس روشنائی کے ہر نکتے سے اس کی تصویر جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کاغذ نہ ہو۔ ایمان خود میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط میرے لیے پوری ملاقات سے بھی بڑھ کر تھا۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی، قریب ہی چند کاغذ اور ایک پینسل میز پر دھری پڑی تھی۔ مَیں نے پینسل اُٹھائی اور کاغذ پر چند سطور کھینچ دیں۔

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تُم کو خبر ہونے تک

مَیں نے اس کے گھر میں غالب کو بکھرے پایا تھا، غالب اُس کا پسندیدہ شاعر تھا، مَیں نے اسی کے پسندیدہ شاعر کی زبان اپنا حال بیان کر دیا تھا۔ میری بات تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید اپنے شاعر کی بات اس کو سمجھ میں آ جائے۔ دوسرے کاغذ پر میں نے نگہت کے لیے ایک پیغام لکھا کہ اگر حیا اب تک نہیں گئی ہے تو وہ اس کے ذریعے یا پھر کس اور طریقے سے یہ پیغام ایمان تک پہنچا دے۔ مَیں ان دونوں کاغذوں پر سنگ مرمر کا بنا ہوا خوبصورت سا چھوٹا وزن رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا، مَیں زیادہ دیر وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ امی نے شاکر کے علاوہ بھی حویلی کے کسی نوکر کو میرے آنے پہ اطلاع دینے کا پابند کر رکھا ہو۔ میں حویلی کے پھاٹک سے گزرتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ کچھ ہی دور مجھے ایک تانگہ مل گیا اور مَیں اسے اسٹیشن کا پتہ دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مَیں اپنے خیالوں میں اور اس کاغذ کے ٹکڑے کے دل کے اتنے پاس ہونے کے

احساس میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹیشن پہنچ گیا۔

شام ڈھل رہی تھی، پلیٹ فارم پر پہنچا تو صدیقی صاحب کا خاص بنگالی نوکر جوان کا باورچی بھی تھا، پلیٹ فارم پر میری ہی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ لہرایا، وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔

''وہ حماد شاب۔۔۔۔ آپ کو اُدھر بلاتے ہیں۔۔۔۔ آپ کے لیے چاول موسلی بنایا ہے ہم نے۔''

مَیں نے تھکن کا عذر پیش کیا لیکن مَیں جانتا تھا کہ ابراہیم اب مجھے ساتھ لیے بنا یہاں سے نہیں ٹلے گا۔ صدیقی صاحب نے اُسے کچھ اسی قسم کی ہدایات دے کر بھیجا ہوگا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ ہی صدیقی صاحب کے بنگلے جانا پڑا۔ وہ برآمدے میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر وہ بھی کھل سے گئے۔

''ہاں میاں۔۔۔۔ اب بھلا ہماری یاد کیوں آنے لگی۔ اب تو جناب کی صورت دیکھے بھی ہفتہ ہفتہ ہو جاتا ہے۔''

مَیں مسکرایا۔۔۔۔ ''ایسی بات نہیں ہے، آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو آپ ہر دم میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔''

صدیقی صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''لفظوں کی کبھی بھی کمی نہیں رہی تمھارے پاس۔ کبھی تو کسی کو ناراض ہونے کا موقع دیا کرو حماد میاں۔''

صدیقی صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے مَیں انہیں کس طرح اور کیا جواب دیتا رہا۔ میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ بس صدیقی صاحب کی دلجوئی کے خیال سے ان کا ساتھ دیتا رہا۔ ابراہیم نے جلد ہی کھانا لگا دیا۔ وہ ہمیشہ سے چاول مچھلی بہت لذیذ بناتا تھا۔ اور پھر کھانے کے دوران وہ آس پاس ٹہلتا رہتا تاکہ ہم اس کے کھانے کی تعریف کر سکیں۔

انسان ہمیشہ سے صرف اپنے ہُنر کی تعریف کا ہی تو بھوکا رہا ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کے پیچھے کی تاریخ کو اگر کھنگالا جائے تو آپ کو کہیں نہ کہیں اس بھوک کا سراغ

www.Paksociety.com

ضرور ملے گا۔ یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ، کچھ سب سے بڑھ کر کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے، تب انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں مجھے کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ تعریف اور سراہنے کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو ہم ابھی تک پتھر کے دور میں ہی جی رہے ہوتے۔

کھانا کھانے کے بعد مَیں نے صدیقی صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر صحن میں بنے لکڑی کے چھوٹے سے سفید پھاٹک نما گیٹ تک آئے۔ مَیں رخصت لے کر نکلنے لگا تو انہوں نے پلٹنے سے مجھے روک لیا کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے چہرے پر کچھ کھوج رہے ہوں۔

''زندگی کسی ایک رشتے کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اور پھر ہمیں اسے اکیلے ختم کرنے کا حق ہی کہاں ہے۔ ہم اپنی زندگی اپنے لیے جی ہی کب پاتے ہیں، یہ مختصر زندگی تو دوسروں کے لیے جینے میں ہی کٹ جاتی ہے۔ اور مَیں جانتا ہوں کہ تم دوسروں کے لیے جینا خوب جانتے ہو۔''

صدیقی صاحب میرا کندھا تھپک کر واپس اندر مڑ گئے۔ مَیں بھی باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر میونسپلٹی کے لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن کی پیلی (Yellow) روشنی سڑک پر دائروں کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رات کو سڑک پر دُور دُور پھیلی یہ گول روشنیاں ہمارا فاصلہ تو کم نہیں کرتیں البتہ ہمارا سفر آسان کر دیتی ہیں۔ اچھے دوستوں کی طرح، جو اگر ساتھ ہوں تو غم بھی خوشی کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ مجھے اُس وقت کامران کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ مَیں نے گھر سے نکلنے کے بعد اب تک فرداً فرداً تمام حالات کے بارے میں اپنے خطوط کے ذریعے باخبر رکھا تھا، لیکن عبداللہ سے ملاقات کے بعد مَیں اُسے بھی خط نہیں لکھ پایا تھا۔ میں پیدل ہی پلیٹ فارم کی طرف چلتا رہا۔ جانے صدیقی صاحب نے آج میرے گھر سے واپسی کے وقت دوسروں کے لیے جینے والی بات کیوں کہی تھی، کتنی عجیب بات تھی، اپنے حالات سے صرف میں ہی واقف نہیں تھا باقی میرے پاس رہتے سبھی لوگ میرے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کتنے لوگ صرف ایک میری وجہ سے پریشان تھے۔ مجھے اب اس شہر سے کہیں

اور چلے جانا چاہیے۔ بنا کسی کو کچھ بتائے، کچھ بولے۔۔۔۔ ہاں واقعی۔۔۔۔ اب مجھے کس بات کا انتظار تھا، مَیں کیوں اس کی رخصتی قریب آنے کے دن گننے کے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ یہ کہانی تو اب ختم ہو چکی تھی، پردہ کتنے دن بعد گرنا ہے، اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔۔۔۔؟

یہ کیسا ستم تھا۔۔۔۔ میری محبت لٹ رہی تھی اور صدیقی صاحب اور ان جیسے اور کتنے ہوں گے جو اس وقت بھی مجھ سے کسی ڈوبتے جہاز کے کپتان کا سا وقار توقع کرتے تھے، ایک ایسے بحری جہاز کا کپتان جو یہ جانتا ہو کہ اس کے آدھے ڈوبے ہوئے جہاز کو پورا غرق ہونے سے اَب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، پھر بھی وہ اپنے عملے اور مسافروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جہاز کے شکستہ عرشے پر سینہ تانے کھڑا رہتا ہے۔ اور آخر کار جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو جاتا ہے، جانے ان لوگوں نے مجھے اتنا دلیر اور اتنے بڑے دل والا کیسے سمجھ لیا تھا۔۔۔؟

OO

www.Paksociety.com

یہودی بستی

شام کو جب مَیں سارہ کے گھر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تب کامران آ گیا۔

''کیا۔۔۔تم اس یہودی بستی میں جاؤ گے، ناممکن۔''

''اوہو۔۔۔مَیں کسی یہودی بستی میں نہیں بلکہ سارہ کے گھر جا رہا ہوں جو یونیورسٹی کے پچھلے بلاک میں ہی واقع ہے۔''

''جانتا ہوں، اُسی کو مَیں یہودی بستی کہتا ہوں۔ تمھارے ایڈمیشن سے پہلے دو مرتبہ تمھارے ہی کام سے گزر ہوا تھا میرا وہاں سے۔ ایک عجیب سی حقارت تھی ان سب کی نظروں میں میرے لیے جیسے میں کوئی انسان نہیں، کسی نالی کا کیڑا ہوں۔ کسی نے میری بات کا صحیح جواب تک نہیں دیا۔ تم نہیں جانتے، صرف تمھارے فارم اس آئزک سے تصدیق کروانے میں مجھے کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میری مانو تو وہاں جانے کا ارادہ بدل دو۔''

مَیں نے مُسکرا کر کامران کے کاندھے کو تھپتھپایا اور اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے لی۔

''فکر مت کرو، تمھارا دوست اتنی میٹھی گولی نہیں ہے جسے وہ لوگ اتنی آسانی سے نگل جائیں گے۔ مَیں صرف سارہ اور اس کی مما کی وجہ سے وہاں جا رہا ہوں۔ ان لوگوں سے ملنا میرے ٹرم پیپر میں بھی میری مدد کرے گا۔ مَیں ان لوگوں کا رہن سہن قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

کامران نے ٹھنڈی سی سانس لی۔

''اچھا۔۔۔پھر اس یہودی حسینہ کو میرا سلام بھی کہہ دینا۔۔۔اور یہ بھی کہنا کہ آئندہ جب بھی تمھیں اپنے گھر کھانے پر بلائے تو ساتھ ہی تمھارے جگری دوست کامران کو بھی ضرور بلائے۔ کیونکہ تم اس کے بغیر کھانا حلق سے نیچے نہیں اُتار سکتے۔''

مَیں آٹھ بجے کے لگ بھگ سر آئزک کے بنگلے پہنچ گیا۔ سارہ نے گیٹ پر ہی میرا استقبال کیا۔ مسز جینی اندر لاؤنج میں موجود تھیں لیکن سر آئزک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سارہ کا گھر بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز سے نفاست اور اعلیٰ معیار ٹپک رہا تھا۔ سارہ کی بنائی ہوئی بہت سی پینٹنگز دیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا عبادت خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ جس کے چوبارے کے گرد بہت سی موم بتیاں ایک خاص ترتیب میں رکھی گئی تھیں۔ ضرور ان موم بتیوں کا تعلق بھی ان کی عبادت کے کسی خاص حصے سے ہوگا۔ سارہ انتظامات میں لگ گئی اور مسز جینی میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہاں تو اب بتاؤ، یہاں تک کیسے پہنچے؟ تمھارے ملک کے بارے میں مَیں نے بہت سنا ہے، لیکن تم اتنے پُراسرار نہیں لگتے جتنی پُراسرار کہانیاں تمھارے لوگوں کے بارے میں سنی تھیں؟

''ایسا کچھ خاص ہے نہیں میرے پاس بتانے کے لیے، اور دوری ہمیشہ چیزوں کو پُراسرار بنا دیتی ہے۔ قریب آنے پر چیزوں اور لوگوں کی پُراسراریت ختم ہو جاتی ہے تبھی میں آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

سارہ جو قریب ہی میز پر پھلوں کی ٹوکری سجانے میں مشغول تھی میری بات سُن کر ہنس پڑی اور ماں سے کہنے لگی۔

''آپ ان سے کسی بات کے سیدھے جواب کی توقع مت کیجیے گا۔ اسے سوالوں کے جواب میں سوال کرنے کی عادت ہے۔''

مسز جینی ہنس پڑیں۔ مَیں نے اپنے بارے میں انہیں مختصراً بتا دیا۔ مسز جینی غور سے سنتی رہیں۔ مَیں نے ان سے سر آئزک کے بارے میں پوچھا۔

''وہ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ ان کی عبادت کا وقت ہے۔ دراصل تمھارے معاملے کی وجہ سے ان میں اور سارہ میں کچھ تناؤ سا چل رہا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ اس لیے ذرا دیر سے ہی آئیں گے۔''

مَیں حیرت سے اس باوقار سی عورت کو دیکھتا رہا، کس قدر آسانی سے انہوں نے بنا کچھ لگی لپٹی رکھے سب سچ سچ بتا دیا تھا۔ سارہ بھی یقیناً انہی کا پرتو ہوگی۔ وہ بھی انہی کی طرح

www.Paksociety.com

صاف دل اور سچی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کوئی بھی بات بنا دیتا لیکن اپنے گھر کی اندرونی بات کبھی نہ بتاتا۔

''اوہ۔۔۔۔ پھر تو آپ کو مجھے یہاں مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے باپ بیٹی کے بیچ تناؤ مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے۔''

''نہیں۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ سارہ نے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مجھے، مَیں خود بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ سارہ کبھی کسی غلط آدمی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ تم سے مل کر مجھے اس بات کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا ہے۔''

کچھ ہی دیر میں سر آئزک بھی گھر کے پچھواڑے سے نمودار ہو گئے۔ آج واقعی وہ اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، جسم پر لمبا سا چغہ اور ہاتھوں میں لکڑی کی بڑی سی تسبیح۔ مجھ سے انہوں نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر ہم موسم کی اور اِدھر اُدھر کی معمول کی باتیں کرتے رہے پھر سارہ نے ہمیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ سارہ اور مسز جینی نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بہت سی ایسی ڈشز تیار کی تھیں جو اس سے پہلے مَیں نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ مثلاً کھجور کا ایک خاص قسم کا حلوہ جو اناس اور ناریل کی قاشوں میں اُبال کر بھرا گیا تھا۔ ہرن کے گوشت کے نمکین کباب اور اس جیسی اور جانے کیا کیا سوغاتیں۔

مَیں نے مسز جینی سے کھل کر کھانے کی تعریف کی اور انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارہ بھی واقعی اتنا کچھ بنا سکتی ہوگی۔ جواب میں سارہ صرف مسکراتی رہی۔ سر آئزک نے سارہ سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ کھانے کے بعد مسز جینی اور سارہ کچن میں مصری قہوہ بنانے کے لیے چلے گئے۔ مَیں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ گھر میں جو دو چار ملازمائیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں، انہوں نے صرف کھانا لگانے اور برتن اُٹھانے میں ماں بیٹی کی مدد کی ورنہ زیادہ تر کام خود سارہ اور مسز جینی نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ یہودیوں کا دوسروں کو عزت دینے کا ایک خاص انداز تھا۔ مجھے کامران کی بات یاد آئی جو اُس نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

سارہ اور جینی کے جانے کے بعد میں اور سر آئزک ڈائننگ ٹیبل پر تنہا رہ گئے، انہوں

نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ تم کوئی بہتر پرچہ تیار کرو گے۔ کیونکہ یہ آئندہ ہمیشہ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں رہنے والی ایک چیز ہوگی۔'' مَیں ان سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا۔

''یقیناً سر۔۔۔۔ میں پوری تحقیق کے بعد ہی اپنا نظریہ اس پرچے کی صورت میں جمع کراؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔''

''تم نے اس سلسلے میں لائبریری میں موجود کتابوں سے تو کافی مدد لی ہوگی۔''

''جی بالکل۔۔۔۔ نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری سے بلکہ شہر کی دیگر لائبریریوں سے بھی میں نے کافی مدد لی ہے۔ شہر میں اور انٹرنیٹ پر جتنا مواد مجھے مل سکتا تھا مَیں نے اکٹھا کر لیا ہے۔'' میری بات پر سر آئزک نے چونک کر سر اُٹھایا۔

''کس کس کتاب سے حوالے جمع کیے ہیں تم نے۔''

میں نے انہیں سر ڈیوڈ رونگ کی کتاب سے لے کر اب تک اس موضوع پر چھپنے والی تمام کتابوں کے نام گنوا دیے۔ سر آئزک کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ کچھ تلخ لہجے میں بولے۔

''اتنے اہم موضوع پر لکھنے کے لیے تم نے ان گھٹیا اور بے تحقیق قسم کی کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ اگر تمھیں مدد کی ضرورت تھی تو مجھے کہتے مَیں تمھیں ان سے ہزار درجہ بہتر کتابوں کے نام بتا سکتا تھا۔''

''اتنے میں سارہ اور مسز جینی بھی قہوہ لے کر میز پر آ چکی تھیں۔ سارہ نے اپنے باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

''پاپا بہتر ہوگا کہ ہم یونیورسٹی کی باتیں یونیورسٹی میں ہی ڈسکس کریں، یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

لیکن سر آئزک کے لہجے کی تلخی اَب بھی برقرار تھی۔

''یہ بات صرف یونیورسٹی یا لائبریری میں جمع کیے جانے والے ایک ٹرم پیپر کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارے عقیدے اور نظریے کی بات ہے۔ اور مَیں کسی کو بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کے بیچ ممتاز اور منفرد نظر آنے کے لیے اپنے اس نظریے

www.Paksociety.com

کا غلط پرچار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"سر مَیں نے کبھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یا منفرد نظر آنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ اور پھر مَیں غلط ہوں یا صحیح، اس کا فیصلہ آپ ابھی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ پہلے میرا پرچہ تو جمع ہو جانے دیں۔ پھر مَیں اس پر کیے گئے اعتراضات کا جواب بھی پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ دوں گا۔"

سر آئزک نے کڑے تیوروں کے ساتھ میری بات سُنی۔ پھر انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا اور وہاں سے اُٹھ گئے۔ لیکن جاتے جاتے انہوں نے عبرانی میں مسز جینی سے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ گھر میں ایک غلط مہمان کو مدعو کیا گیا ہے۔ سارہ نے احتجاجی انداز میں زور سے سر آئزک سے صرف اتنا کہا۔

"پاپا۔۔۔۔"

"سر آئزک اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ مَیں عبرانی زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سارہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور وہ پیر پٹختے ہوئے باپ کے پیچھے اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مَیں نے مسز جینی سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے کھلے دل سے اپنی غلطی تسلیم کی کہ ان کے شوہر کی وجہ سے بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات کے لیے انہوں نے مجھ سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن مَیں نے فوراً انہیں روک دیا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مجھے یہاں آ کر واقعی بہت اچھا لگا۔ آپ سے ملنا بھی زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ ہے۔ آپ کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دراصل مَیں سمجھتی تھی کہ تمھارے یہاں آنے سے آئزک کو تمھارے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملے گا۔ اور اُن کے اور سارہ کے بیچ میں تناؤ میں کچھ کمی آئے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ مَیں نے آج تک پوری زندگی میں کبھی آئزک کو اس قدر بدتہذیب برتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔"

مَیں مسز جینی کا ہاتھ تھپک کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ انہوں نے باہر تک مجھے چھوڑنے کے لیے آنا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ہمارے ہاں بڑے چھوٹوں کو یوں شرمندہ نہیں

کرتے۔ مَیں باہر نکلا تو ہوا خنک تھی اور ہوا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ذرّے شامل ہو کر اِدھر اُدھر ڈولتے ہوئے گر رہے تھے۔ مَیں نے اپنی جیکٹ کے کالر اُٹھا لیے اور دُور اینٹوں سے بنی پکی روش پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے سارہ مجھے آوازیں دیتی، اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُس نے جلدی میں کوئی گرم چیز بھی اوپر اوڑھنے کے لیے نہیں لی تھی اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کپکپانے لگی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔ تم مجھ سے وداع لیے بغیر کیسے نکل پڑے۔۔۔۔ مَیں تو پاپا سے بات کرنے کے لیے دو گھڑی اندر کیا گئی تم تو باقاعدہ رخصت ہی ہو لیے۔؟"

"جس غصے میں تم وہاں سے گئیں تھیں۔ مجھے نہیں لگا تھا کہ تم جلد واپس آؤ گی۔ اور تمھاری مما بے چاری خواہ مخواہ میرے سامنے معذرتیں پیش کر کر کے تھک جاتیں۔ سو مَیں نے سوچا کہ نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ میں رات دیر گئے تمھیں فون ضرور کرتا۔"

سارہ کے چہرے پر بھی خجالت سی تھی۔

"مجھے پاپا سے اس رویے کی اُمید نہیں تھی۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔۔ پلیز۔۔۔" آج مجھے احساس ہوا کہ اس باہمت لڑکی کے اندر بھی ایک بے حد نازک سا دل دھڑکتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں، مَیں نے جلدی سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یقین جانو مجھے سر آئزک کی کوئی بھی بات بُری نہیں لگی۔ انسان اپنے نظریات کے بارے میں جذباتی ہو ہی جاتا ہے۔ وہ تو انہوں نے خود اس بات کا ذکر چھیڑ دیا تھا ورنہ مَیں اس جگہ کبھی ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا۔ تم یقین کرو، یہاں آ کر میرے دل میں تمھاری، تمھاری مما اور سر آئزک کی عزت اور زیادہ بڑھی ہے۔ اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور یہ مَیں پورے خلوص دل سے کہہ رہا ہوں۔"

سارہ کچھ دیر تک یونہی چُپ سی کھڑی رہی۔ مَیں جانتا تھا اُس جیسی وضع دار لڑکی کے لیے یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو سکتا تھا۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی اور اَب باقاعدہ برف باری شروع ہو گئی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے ہم دونوں کے بالوں میں چاندی سی بکھیرنے لگے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر سارہ کے کاندھوں پر ڈال دی، اور اس کے بال بکھیر دیے۔

www.Paksociety.com

''چلو اَب تم اندر جاؤ۔ سردی بڑھتی جارہی ہے، کہیں تمھیں کچھ ہوگیا تو سر آئزک واقعی میرا داخلہ یونیورسٹی میں بند کردیں گے۔''

میرا یہ وار کارگر رہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا دیکھ کر مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا۔ اُس نے ہلکے سے مجھے چھیڑا۔

''آج احساس ہورہا ہے کہ تم لوگوں کو کیسے جیت لیتے ہو۔ لیکن یاد رہے یونیورسٹی میں تمھاری اور تمھارے نظریات کی سب سے بڑی مخالف اَب بھی مَیں ہی ہوں۔ مَیں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔''

مَیں مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ مَیں نے اگنیشن آن کی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے جواب دیا۔

''چلو تم نے آج اتنا تو تسلیم کرلیا کہ تم کبھی نہ کبھی ہاروگی ضرور۔۔۔۔ چاہے آسانی سے نہ سہی۔۔۔۔ بہت جدوجہد اور جستجو کے بعد ہی سہی۔۔۔۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہا۔ جب مَیں گاڑی اس کے محل نما گیٹ سے باہر نکال رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر Back view mirror میں دیکھا کہ وہ ابھی تک تیز گرتی برف میں وہیں کھڑی مجھے جاتا دیکھ رہی تھی۔ برف اس کے بالوں اور ہلکے سے گڑھے پڑے گالوں کو چھو چھو کر زمین پر گر رہی تھی۔ جیسے طرف کی کوئی شہزادی اپنی سلطنت میں کھڑی ہو۔ میری گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور مَیں رفتہ رفتہ اس کے محل سے دُور ہوتا چلا گیا۔ لندن سنسان تھا، رات گہری تھی اور سڑکیں خالی تھیں۔ میرا دوست دریائے ٹیمز بھی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ سفید برف کی رضائی نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے درخت ایک دوسرے کو کہانی سناتے سناتے چُپ سے ہوگئے تھے اور حیرت سے برف کے گالوں کو خود سے شرارت کرتا دیکھ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں گرتی برف کا منظر اور لطف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود کبھی رات میں تنہائی میں کسی ویرانے میں برف گرتی دیکھ چکے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت میں نور کی برسات ہو رہی ہو۔ گرتی برف کی اپنی ایک سفید و دھیما سی روشنی ہوتی ہے جیسے بہت سے جگنو بیک وقت آپ کو راستہ دکھا رہے ہوں۔ ایسے ہی بہت سے جگنو اس وقت میری دوڑتی گاڑی کے آس

پاس گر رہے تھے، مجھے اس وقت بچپن میں نانی اماں سے سُنی ایک لوری بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

''چندا کو ڈھونڈنے سبھی۔۔۔
تارے نکل پڑے
محلوں کی نیند چھوڑ کر
سارے نکل پڑے۔۔۔۔''

میری گاڑی سفید برف سے بھری سڑک پر پھسلتی جارہی تھی۔ مَیں بھی تو اِک ٹوٹا تارہ تھا۔ جو اپنے چاند سے بچھڑ کر جانے کب سے اُسے ڈھونڈ رہا تھا۔

OO

www.Paksociety.com

وہ اِک ملاقات

اس روز صبح سے ہی آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخرِ ستمبر کی میٹھی سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دھوپ اپنی تمازت کھو چکی تھی اور سائے لمبے اور سرد تھے۔ بالآخر بادلوں کے ان شریر ٹکڑوں نے ایک دوسرے کو پکڑ ہی لیا اور سارا آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ مَیں اس وقت گیارہ بجے والی مال گاڑی سے مال اُتروا رہا تھا جب پہلی بوند نے میرا ماتھا چوما تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے مینہ کی جھڑی برسنا شروع ہو گئی۔ مزدوروں نے بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ غفورے نے ایک برآمدے کے لکڑی اور ٹین سے بنے چھت کے نیچے پہنچ کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں کہ مَیں وہاں کھڑا بھیگتا نہ رہوں بلکہ برآمدے کی طرف چلا آؤں۔ جانے لوگ بارش سے کیوں چھپتے ہیں۔ بارشیں تو تن اور من کو بھگو کر اُجلا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔

اتنے میں دُور سے صدیقی صاحب کے دفتر کا چپڑاسی چھتری سر پر تانے بارش میں سڑپ سڑپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پلیٹ فارم کے آخری سرے سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

''حماد بابو۔۔۔۔ صدیقی صاحب کے دفتر میں آپ کا فون آیا ہے، وہ بلاتے ہیں آپ کو۔''

''میرا فون۔؟''

مَیں حیرت سے بڑبڑایا۔ لیکن زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ غفورے کو ہاتھ کے اشارے سے دُور ہی سے سمجھایا کہ میرا فون آیا ہے۔ صدیقی صاحب کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں پورا شرابور ہو چکا تھا۔ اس لیے دروازے

کے باہر کھڑے ہو کر باقاعدہ خود کو جھاڑنا پڑا۔

اندر داخل ہوا تو دو چار ملاقاتی یا شاید مسافر صدیقی صاحب کی میز کے گرد جمع تھے۔ صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک ہی نمبر کی دو لائنیں تھیں۔ ایک فون ان کی میز پر اور دوسرا سامنے بیٹھے ہیڈ کلرک میز پر رکھا تھا۔ زیادہ تر فون ان کا ہیڈ کلرک بشیر ہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی فون خاموش کریڈل پر پڑے تھے۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ صدیقی صاحب نے فائلوں پر سے نظر اُٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔

''لائن لمبی ہوتی جا رہی تھی، مَیں نے دوبارہ کرنے کا کہا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی کال آتی ہی ہوگی۔''

مَیں وہیں ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشیر نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''کسی لڑکی کا فون تھا۔''

مَیں نے چونک کر بشیر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ کے علاوہ دیگر کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ کون سی لڑکی تھی جو مجھے صدیقی صاحب کے نمبر پر فون کر رہی تھی۔؟

باہر موسلا دھار بارش مزید تیز ہو گئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جہاں تک اسٹیشن اور پلیٹ فارم دکھائی دیتا تھا وہاں ہر چیز جیسے دھل سی گئی تھی۔ کالی چھتریاں تانے لوگ ادھر اُدھر تیزی سے چلتے ہوئے گزر رہے تھے، کچھ دُور اندیش جو صبح کے وقت موسم کے تیور دیکھ کر گھر سے نکلتے تھے اور وہ اپنی لمبی لمبی برساتیاں پہنے، کالر اُٹھائے دوسروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھو ہم جانتے تھے کہ آج بارش ہوگی۔ اتنے میں اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مَیں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھا کہ بس اُچھلتے اُچھلتے رہ گیا۔ بشیر نے فون اُٹھایا۔

''جی۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔ یہ لیں بات کریں۔''

بشیر نے فون میری طرف بڑھایا، مَیں نے ریسیور کان کے ساتھ لگایا۔

''ہیلو۔۔۔۔ حماد بول رہا ہوں۔''

www.Paksociety.com

دوسری طرف سے ایک نازک اور مخملی سی آواز اُبھری۔

''جی۔۔۔۔ہیلو۔۔۔۔''

''جی کون بول رہی ہیں۔''

''مَیں۔۔۔۔مَیں حیا بول رہی ہوں۔''

میرے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ حیاء۔۔۔۔؟ فون پر۔۔۔۔ یہاں۔۔۔؟اس وقت۔۔۔۔؟

''آپ۔۔۔۔آپ کو یہ نمبر کیسے۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، سب ٹھیک تو ہے نا۔''

حیا کچھ جلدی میں اور کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

''جی۔۔۔سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ آج شام چار بجے پُرانی حویلی آ سکتے ہیں۔''

''پُرانی حویلی۔۔۔۔جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔۔لیکن۔''

''کوئی سوال نہ پوچھیئے گا، مَیں ہمسایوں کے ہاں سے بڑی مشکل سے فون کر رہی ہوں بس آپ تک ایمان آپی کا یہ پیغام پہنچانا تھا۔ دیکھیں وقت پر آ جایئے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ آیئے گا ضرور۔ خدا حافظ۔

ایمان کا پیغام۔۔۔۔یا خدا۔۔۔۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ایمان بھی وہاں آنے والی تھی، مَیں نے فوراً اسے روکنے کے لیے کہا۔

''ہیلو۔۔۔ہیلو میری بات۔۔۔۔''

لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ باہر زور سے بادل گرجا اور پھوار کا ایک تیز ریلا ہوا کے ایک شدید جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے آ کر ٹکرایا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پانی کی بوندیں اندر کمرے میں بہت کچھ بھگو گئیں۔ بشیر نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی بند کی۔ مَیں اَب تک ویسے ہی گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حیا کیا کہہ گئی تھی۔ ایمان نے مجھے پُرانی حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا۔۔۔؟۔۔۔کیا واقعی وہ خود بھی حویلی آ رہی تھی۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تین ہفتوں کے بعد اُس کی رخصتی ہونے والی ہے۔ وہ ایسے ہی گھر سے کیسے نکل سکتی ہے، تو پھر۔۔۔۔حیا نے مجھے حویلی یہ کہہ کر کیوں بلایا ہے کہ یہ ایمان کا پیغام ہے۔۔۔؟ ہو سکتا ہے ایمان نے میرے اس دن کے غالب والے شعروں کے بدلے میں

کوئی پیغام دیا ہو۔۔۔۔لیکن کیا۔۔۔۔؟۔۔۔۔

کچھ دن سے صدیقی صاحب نے مجھے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بنا ہوا ہٹ الاٹ کر دیا تھا جس کی چھت ٹین کی تھی۔ یہ اسٹیشن کے عقب میں درختوں بھری اِک سڑک کے اختتام پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں ایسے بہت سے ہٹ ریلوے کے چھڑے اور کنوارے افسروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیسے ان ہٹس میں سے یہ ایک ہٹ خالی ہوا تو صدیقی صاحب نے عارضی طور پر میرے نام الاٹ کر دیا۔ مَیں بشیر کی میز سے فون سن کر گم صم سا اُٹھا اور اپنے ہٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹین کی چھت پر بارش کی بوندیں اپنا مخصوص جلترنگ بجا رہی تھیں۔ لگتا تھا آج آسمان نے بھی کھل کر برسنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو مَیں بارش اور اس ٹین کے چھت کے جلترنگ کا خوب لطف لیتا کیونکہ بچپن میں میں اور کامران ایسی بارش میں فوراً میری دادی اماں کی حویلی کے ٹین کے چھت والے کمرے میں بھاگ کر آ جاتے اور پھر ہم ٹین کی چھت پر گرنے والی بارش یا پھر اولوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کو میز بجا بجا کر مختلف دھنوں میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کرتے اور چیخ چیخ کر اپنے بچپن کے گانے گاتے تھے۔

لیکن اس وقت میرا سارا دھیان حیا کے فون کی طرف تھا۔ میری اپنی سوچوں میں دن کے تین بج گئے، مَیں اس وقت زور سے چونکا جب اسٹیشن کے بڑے گھڑیال نے تین بجے کا گھنٹہ بجایا۔ ٹن، ٹن، ٹن۔۔۔۔

اوہ۔۔۔۔ اس وقت تک تو مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اتنی تیز بارش میں جانے کوئی سواری بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ابراہیم میری اکلوتی پینٹ اور شرٹ حسب معمول دھلوا کر اور ریلوے کے دھوبی سے استری کروا کر کمرے میں لٹکا گیا تھا۔ مَیں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ لیکن پھر مجھے خود پر ہی ہنسی آ گئی۔ مَیں نے ایک بھیگا جوڑا جو میری وردی کی صورت میں تھا، وہ تو اتار دیا تھا، لیکن میرے پاس بھلا کون سی چھتری تھی جو مَیں اس دوسرے جوڑے کو بھی بھیگنے سے بچا پاتا۔ بہر حال، اب یہ وقت چھتری ڈھونڈنے کا نہیں تھا۔ مَیں تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا پلیٹ فارم جانے والی پٹری سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم تک جا پہنچا۔ بارش کی وجہ سے آس پاس

www.Paksociety.com

کوئی دکھائی نہ دیا۔ مَیں نے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک آدھ تانگہ اور ایک دو ٹیکسیاں وہاں سے گزریں لیکن سبھی میں سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خیرو بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مَیں نے وہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ مَیں پیدل ہی بڑی سڑک پر چل پڑوں۔ شاید راستے میں کوئی سواری مل ہی جائے۔ بارش میرے پورے وجود کو بار بار کسی چھلنی کی طرح چھل رہی تھی۔ اسٹیشن سے کافی دُور آنے کے باوجود مجھے ابھی تک کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں وقت پر پُرانی حویلی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کیونکہ ساڑھے تین تو مجھے یہاں شہر میں ہی ہو گئے تھے۔ مجھے خود پر شدید غصہ آنے لگا کہ مَیں پہلے ہی اسٹیشن سے کیوں نہیں نکل آیا تھا۔

پھر جیسے اچانک ہی قدرت کو میری بے بسی اور جھنجلاہٹ پر رحم آ گیا۔ مَیں اس وقت لٹن روڈ کی بڑی سڑک سے ہوتا ہوا چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور اسٹاف کالج روڈ کے قریب پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک موڑ سے ایک خالی تانگہ جو شاید کسی فوجی سواری کو اسٹاف کالج چھوڑ کر واپس جا رہا تھا، نمودار ہوا۔ میں نے فوراً تانگے والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی روپے ہاتھ میں آئے مَیں نے اُسے تھما دیے اور اُسے تیز اور جلدی پُرانی حویلی کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور پکی ڈھلی سڑک پر تانگہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ آس پاس گھنے بادلوں اور کالی گھٹا کی وجہ سے گہری شام جیسا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایسے میں جب بجلی زور سے چمکتی تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے پل بھر کے لیے تمام ماحول پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ بادل ویسے ہی زور زور سے گرج رہے تھے اور برستی بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتے ہوئے پانی سے شرابور گھوڑے کے نتھنوں سے ہر لیتی سانس کے ساتھ گرم بھاپ کے مرغولے سے اُٹھ رہے تھے۔ پکی سڑک سے اُتر کر گھوڑا گیلی کچی زمین پر جمے پانی کے گڑھوں اور کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا پُرانی حویلی کے راستے پر رواں دواں تھا۔

تانگے والے نے اپنے معاوضے کا پورا حق ادا کیا اور مجھے ٹھیک چار بجے حویلی کے پھاٹک پر اُتار دیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور تانگا بھی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کوئی سواری آئی تھی

جس نے موسم کے تیور دیکھ کر اُسے واپسی کے لیے یہیں روک لیا تھا۔ میرے تانگے والے نے بھی مجھے پیش کش کی کہ مَیں اگر واپسی کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ یہیں انتظار کر لے گا۔ مَیں نے اُسے بھی رکنے کا کہہ دیا۔ دونوں تانگے والے آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ مَیں برستی بارش سے بھیگا لکڑی کا پھاٹک کھول کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب سا سناٹا اور ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی پورے ماحول پر۔

اچانک حویلی کا پُرانا چوکیدار اللہ بخش کسی جانب سے نمودار ہوا اور مجھے سلام کر کے بتانے لگا کہ نگہت بی بی ابھی بڑے گول کمرے کی طرف گئی ہیں۔ پُرانی حویلی کے یہ سارے پُرانے نوکر میرے بچپن کے گواہ تھے اور شاید سبھی میرے راز دار بھی۔ ان سبھی کو یہ پتا تھا کہ مَیں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور مَیں شاکر اور نگہت وغیرہ سے ملنے یہاں آتا ہوں۔ سبھی یہ بھی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میری یہاں آمد کے بارے میں باخبر نہیں تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے جا کر بابا یا امی کو میرے بارے میں خبر نہیں دی تھی۔ شاید اس طرح سے ان سب نے میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

میں چوکیدار سے مل کر آگے دالان کی طرف بڑھ گیا جس کے سرے پر برآمدہ تھا جس کے سامنے گرمیوں میں ایک قطار سے لکڑی کی بڑی بڑی سے چکیں ڈلی رہتی تھیں۔ اس وقت بارش کی وجہ سے تمام چکوں کو گول سمیٹ کر اوپر بندھی برآمدے کی ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ برآمدے کی چھت پر بنے پرنالوں سے بارش کا مٹیالا پانی پوری رفتار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا اور اینٹوں سے بنے صحن میں بنی ہوئی چھوٹی کچی اینٹ کی نالیوں سے ہوتا ہوا مختلف کیاریوں میں گر رہا تھا۔ فضا میں صرف ایک ہی پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی باقی سب کچھ جیسے جامد تھا۔

جیسے ہی مَیں گول کمرے والے برآمدے کی طرف مڑا۔ مجھے برآمدے کے کونے میں سفید چادر میں لپٹی حیا دکھائی دی جو برآمدے کی چھت سے گرتے پانی کے ایک پرنالے سے بنتی پھوار کو اپنی ہتھیلی میں جذب کرنے کی کوشش میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

آہٹ سن کر اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اور جلدی سے مجھے سلام کیا۔ میں اس کی طرف چلا آیا۔

www.Paksociety.com

''آپ اِس موسم میں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں۔ سب خیریت تو ہے نا۔''

وہ ہلکے سے مسکائی۔

''ہم تو عام اور اچھے موسم میں بھی گھر سے نہیں نکل پاتے، لیکن آپ کی ان چار لائنوں نے آنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔''

مجھے اس کے جواب سے کچھ اُلجھن سی ہوئی۔

''مَیں سمجھا نہیں۔۔۔۔ آپ۔''

پھر مجھے فوراً نگہت کا خیال آیا۔

''نگہت کہاں ہے۔ آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

اُس کی آنکھوں میں اَب وہی مخصوص سی شرارت تھی۔ وہ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''مَیں اکیلی نہیں ہوں، جائیے مل لیجئے۔۔۔۔''

مَیں اسی حیرت اور اُلجھن میں اس نازک اندام کو دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر نگہت اندر کمرے میں تھی تو پھر وہ یہاں باہر برآمدے میں برستی بارش میں کیوں کھڑی تھی۔ بجلی بھی شاید بارش آتے ہی جا چکی تھی۔ اندر کمرے میں دو چار شمعیں روشن تھیں۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو چند لمحے تو مجھے اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ دفعتاً بادل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے پل بھر کے لیے سب کچھ روشن کر دیا اندر کمرے میں دیوار کے ساتھ سکڑی بیٹھی ہوئی ریشمی وجود کی ایک گٹھڑی میں پل بھر کے لیے ایک جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ طاق پر رکھی موم بتی کا شعلہ زور سے پھڑکا اور کسی کے ماتھے پر وہی اِک مخصوص شرارتی سی لٹ لہرا گئی۔ سارا کمرہ اس کی جبیں کے نُور سے روشن ہو گیا۔ وہ ایمان تھی۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ وہ ایمان ہی تھی۔۔۔۔ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میں وہیں دروازے کے پاس اس معجزے کے ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ شاید نہیں۔۔۔۔ یقیناً یہ کوئی خواب ہی تھا۔ میری تقدیر مجھ پر اتنی مہرباں تو اِک زمانے سے نہ تھی۔

لیکن وہ ایمان ہی تھی۔ سرتا پیر مجسم ایمان، اُس نے سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا اور

ایک کالی شال میں ڈھکی ہوئی تھی۔ شاید باہر کھڑے تانگے میں ایمان اور حیاء وغیرہ بھی آئی تھیں۔ کیونکہ ایمان کے ماتھے پر اور بالوں میں ابھی تک بری بوندوں کے ستارے ٹمٹمار ہے تھے۔ ماتھے کی لٹ بھی بھیگی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کونے میں بیٹھی حسبِ معمول اپنے نازک پاؤں کے ناخنوں سے نیچے بچھے قالین کو کرید رہی تھی۔ اُس نے دھیرے سے ویسے ہی سر جھکائے مجھے سلام کیا۔ چند لمحے تو مَیں اسے کچھ بول ہی نہیں پایا، جیسے میری آواز ہی گنگ ہو گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے میری زبان سے کچھ نکلا۔

''آپ۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔؟ ٹھہریئے۔۔۔۔ کچھ دیر لگے گی مجھے اپنی قسمت اور خوش نصیبی پر یقین کرنے میں۔''

پہلی مرتبہ مَیں نے ایمان کے چہرے پر حیاء کی ایک سُرخ لہر کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے یوں بارش میں بھیگا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

''آپ۔۔۔۔ آپ تو بہت بھیگ چکے ہیں۔ میں نگہت سے کہتی ہوں آپ کے لیے کوئی تولیہ وغیرہ۔۔۔۔''

اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ جیسے مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ اس کمرے سے نکل گئی تو میرا یہ زندگی کا سب سے خوبصورت خواب اُدھورا ہی ٹوٹ جائے گا۔

''پلیز۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ آپ بیٹھی رہیں۔۔۔۔ مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔ کچھ دیر میں خود ہی سب خشک ہو جائے گا۔۔۔ آپ کہیں نہ جائیں۔۔۔۔ پلیز۔''

مَیں جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اُس کے قریب آ گیا۔ ایمان اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اب وہ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اتنے قریب۔۔۔۔ کہ مَیں اس کے وجود کی لرزش کو یہاں سے محسوس کر سکتا تھا۔ مَیں وہیں اس کے قریب بیٹھ گیا، اور بیٹھتے وقت مَیں نے اس زہرہ جبیں کے حجاب بھرے سمٹنے کے انداز کو بھی محسوس کیا۔ یہ لڑکی تھی، یا پھولوں بھری اِک لچکتی ڈال۔۔۔۔

چند لمحے ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی اپنے وجود کی لرزش پر

www.Paksociety.com

قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور مَیں پلکیں جھپکے بنا اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پلکیں جھپکنے کا وقفہ بھی اس وقت مجھے بے حد بُرا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں۔ اتنی مشکل تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی بیچ کی خاموشی کا خلا صرف باہر برستی تیز بوندیں پورا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے ہم دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ہم دونوں کے لفظ ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ میں پکڑا وہ تہہ کیا ہُوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا جس پر مَیں نے اس دن وہ چند شعر لکھے تھے مَیں جانتا تھا کہ اس تک یہ کاغذ کسی نہ کسی طور ضرور پہنچا۔ ئے گی۔

''آپ نے یہ کیا لکھ بھیجا تھا مجھے۔۔۔؟۔۔۔مَیں نے تو آپ سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔۔۔۔گھر واپس چلے جائیں۔'' آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔''

بولتے بولتے اُس کی آواز ہلکی سی بھرّا گئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے نازک سے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی سی رگیں نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر بھی ایک پیلا پن سا تھا۔

''آپ تو مجھے بیمار لگ رہی ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

اُس نے مجھ پر اک نظر ڈالی۔ اِک زخمی سی نظر جس میں نہ جانے کیا کچھ چھپا تھا۔

''مَیں یہاں آپ سے صرف یہ وعدہ لینے آئی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو مزید سزا نہیں دیں گے۔ اس دن۔۔۔۔آپ نہیں جانتے اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو کتنا ملامت کیا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ہے۔ نہ آپ مجھے دیکھتے اور نہ۔۔۔۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔۔۔۔آپ کو دیکھنا میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ تھا اور آپ کی محبت میری اس بے معنی زندگی کا سب سے حسین تجربہ ہے۔ اس محبت نے مجھے آپ سے ملوا دیا۔۔۔۔ورنہ میں تو بنا خود کو پہچانے ہی اس دُنیا سے چلا جاتا۔۔۔۔اب مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔۔۔۔موت بھی آئی تو۔۔۔''

میری بات اُس نے تڑپ کر کاٹ دی۔ ''بَہ

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، کیوں مجھے میری نظروں میں بار بار گراتے ہیں۔۔۔۔کیوں۔۔۔۔''

وہ اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی رو پڑی۔ دو موٹے موٹے آنسو اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے چھلکے اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی پر انہیں سمو لیا۔ اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس جذبے کے عالم میں، مَیں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اُس کے دونوں کومل مخمل جیسے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ باہر بادل زور سے گرجے اور بارش کی جھڑی اور تیز ہو گئی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر ہم دونوں۔ جانے اس کے ہاتھ پکڑتے ہی خود میرے اندر سے یہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں سے باہر اُمڈ پڑا۔ بجائے اس کے کہ مَیں اُسے چُپ کرواتا خود میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس کے نرم ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، کیا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور کسی گھڑی کی تمنا کی جا سکتی تھی؟

ایمان نے نظر اُٹھا کر بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کے حسن کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ستارہ جبیں، بڑی بڑی کالی آنکھوں ستواں سی چھوٹی ناک اور لال زمرد جیسے نازک سُرخ لبوں کی پنکھڑیاں، ٹھوڑی کا خم جیسے کسی مصوّر نے بڑی ادا سے رنگوں کو ایک مخصوص زاویے پر لا کر موڑ دیا ہو۔ کہیں بھی تو کچھ کمی نہیں تھی۔ اِک عجب سا نور تھا اس مہہ رُخ کے چہرے پر۔

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں سے اُس کی آنکھوں کے بھیگے کنارے پونچھ ڈالے اُس نے دھیرے سے پھر کہا۔

''آپ میری بات مانیں گے نا حماد۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا نام مجھے اس قدر مقدس، اس قدر محترم اور اس قدر خوابناک محسوس ہوا کہ پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام پکارا تھا۔

''اگر تمھیں اس سے خوشی ملتی ہے تو مَیں تمھاری خاطر یہ بھی کر گزروں گا۔'' میرے منہ سے اپنے آپ اس کے لیے تم نکل گیا۔'' اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑائے

www.Paksociety.com

اور اپنے دوپٹے کے سر پر لگی گانٹھ کھول کر نہ جانے کیا چیز ہتھیلی میں بھر لی، پھر اُس نے ہتھیلی میرے سامنے کی اور کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر وہی دو موتی جگمگا رہے تھے جو مَیں نے نگہت کے ہاتھ اُسے واپس بھجوائے تھے۔

''یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ کی یہی ضد تھی نا کہ مَیں خود انہیں آپ کو واپس کروں۔ آج مَیں نے آپ کی یہ ضد بھی پوری کر دی۔ اب انہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔ اُس نے جلدی سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اس گل اندام کو کیسے سنبھالوں۔۔۔۔ کیا تسلی دوں۔ یہ تو مجھ سے زیادہ گھائل نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے دونوں موتی اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں چوما اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''ایمان۔۔۔۔ پلیز چُپ ہو جاؤ۔ یہ دو موتی میرے لیے دو جہانوں کی تمام نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی مجھے کیا دے گا۔ سچ کہوں تو آج مجھے اپنی محبت بُری لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے تو رونا سکھا ہی دیا تھا۔ آج تمھاری آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔ بہت بُرا ہوں مَیں۔۔۔۔ اور بہت بُری ہے میری محبت۔''

اُس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اضطراری طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میری بات کاٹنا چاہتی ہو۔ مجھے اپنی محبت کو بُرا بولنے سے روکنا چاہتی ہو۔

''ایسے نہ کہیں، اگر کوئی بُرا ہے تو صرف مَیں ہوں۔۔۔۔ اگر کوئی قصور وار ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔۔ میں آپ کی محبت کے بدلے کچھ نہیں دے پائی آپ کو۔۔۔۔ آپ نہیں جانتے حماد۔۔۔۔ مَیں کتنی مجبور ہوں۔۔۔۔ کتنی بے بس ہوں۔۔۔۔ ابا نے ساری زندگی کسی خوشی کا منہ نہیں دیکھا۔ میں اور حیا ابھی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے بڑے بھیا آناً فاناً بیماری کا شکار ہو کر ہم سب سے منہ موڑ گئے۔ ابا ان کا غم ابھی تک دل سے نہیں نکال پائے۔ انہوں نے مجھے اور حیا کو دنیا کی ہر وہ نعمت لا کر دی جس کی کوئی اولاد خواہش کر سکتی ہے۔ خود پیوند لگے کپڑے پہنتے رہے لیکن ہمیں کبھی کسی سخت وقت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھیا کے بعد انہوں نے اپنی ساری توقعات مجھ سے وابستہ کر لی تھیں۔ تبھی انہوں نے گھر پر ہی

مجھے دنیاوی اور دین کی ہر تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ مجھے ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ مجھ سے مسائل پر بحث کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں ہی ان کا سارا جہاں ہوں۔ میں ہی ان کا دن ہوں۔۔۔۔ میں ہی ان کی رات ہوں میرے سفید دامن پر ایک دھبہ ان کی جان لے لے گا۔ وہ آپ کی طوفانی محبت سے بہت گھبرا گئے تھے۔ تبھی انہوں نے عجلت میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا ورنہ وہ ابھی مجھے مزید پڑھانا چاہتے تھے۔ میرا بی۔ اے کا داخلہ بھی بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن آپ کی دیوانگی، آپ کے جنون کے آگے سب بہہ گیا۔''

میں چُپ چاپ خاموش بُت بنا اس سنگِ مرمر کے حسین مجسمے کے لبوں سے لفظوں کے موتی گرتا دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم بھی میری محبت، میرے عشق، میری دیوانگی، میرے جنون کو غلط سمجھتی ہو۔''

میرے ہاتھ پر ایمان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے لگا وہ میرے ہاتھوں کو تھام کر آج میری روح ہی کھینچ لے گی۔۔۔۔ ''شروع میں جب آپ نے نگہت کے ذریعے مجھے اس حویلی میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا تب مجھے واقعی بہت بُرا لگا تھا۔ مَیں بھی ابا کی طرح ایسی باتوں کو نہایت بُرا سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اُس وقت آپ کی وہ سب کوششیں کسی امیرزادے کا اپنا دل بہلانے کی ترکیب ہی لگیں۔ پھر جب ایک دن آپ کے گھر والوں نے ابا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو مَیں بہت روئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کے قصور کی سزا ہمیں کیوں سنا دی۔ پھر نگہت سے پتہ چلا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت مَیں نے اسے آپ کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا اور یہی سوچتی تھی کہ دو چار دن میں آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر مَیں نے ابا کو دوبارہ بہت پریشان دیکھا۔ جس دن آپ ہمارے گھر میرا رشتہ مانگنے آئے تھے اس دن کے بعد سے میں نے آج تک ابا کو کبھی چین کی نیند سوتے نہیں دیکھا۔ ساری ساری رات ٹہلتے رہتے تھے۔ میری اماں ایک سیدھی سادھی سی عورت ہیں جو صرف رو کر ہی اپنے شوہر کا دکھ بانٹ سکتی ہیں۔ پھر عبداللہ نے بتایا کہ آپ نے ابا کی مسجد میں آنا شروع کر دیا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی عبداللہ نے تب بھی اور نہ ہی آج تک آپ کے بارے میں کوئی سخت لفظ استعمال کیے

www.Paksociety.com

ہیں۔۔۔۔میرا دل اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے، جس سے آپ کی زندگی بھر میں دو ملاقاتیں بھی نہ ہوئی ہوں، اس کے لیے کوئی اس طرح دُنیا تیاگ سکتا ہے۔

لیکن پھر وہ ہو کر ہی رہا جسے میرا دل اس دن تک جھٹلاتا رہا تھا، اس دن آپ کو ریلوے اسٹیشن پر مزدور کے حلیے میں دیکھ کر ایک ہی لمحے میں میری ساری زندگی کا فخر، میری ساری زندگی کا غرور، میرے سب مان، پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کی محبت کسی بے لگام آندھی کی طرح آئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے دل کے برسوں سے بند کواڑ توڑ کر اندر براجمان ہو گئی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر پائی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ محبت تو اس دن سے کہیں نہ کہیں میرے دل میں ہی پل رہی تھی جس دن آپ نے یہیں اس حویلی کی لائبریری میں میرا رستہ روکا تھا۔ لیکن تب شاید میں اس جذبے سے اس قدر ناواقف تھی کہ اُسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن اس دن اسٹیشن پر آپ نے مجھے مار ڈالا۔ تب سے اب تک مجھے ایک پل بھی قرار نہیں آیا۔ میری ہر وقت یہی سوچتی ہوں کہ یہ کیسا جذبہ ہے جو پل میں شہنشاہ کو فقیر اور فقیر کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ یہ کیسا درد ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل کو چیرتا رہتا ہے۔ کتنا بے بس کر دیا ہے اس جذبے نے مجھے۔۔۔۔ کتنا مجبور۔''

میں حیرت سے گنگ اس مہتاب کو سنتا رہا، اس کی پلکوں سے گرتے موتی چنتا رہا۔ وہ اس وقت مجھے پریوں کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی جس کی باتیں میرے لیے کسی الف لیلوی داستان سے کم نہیں تھیں۔ ان چند لمحوں نے ہی میری بے توقیر محبت کو کس قدر معتبر بنا دیا تھا۔ میری اس لاحاصل جدوجہد کو کتنا عظیم اور کتنا معنی خیز بنا دیا تھا۔ وہ بولتی رہی۔

''اور پھر رہی سہی کسر اس دن آپ کے اُن دو اشعار نے پوری کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو زندگی بھر کبھی اپنی حالت کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ کبھی آپ سے نہیں ملوں گی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔ اس دن ان دو لائنوں نے میرا اندر بالکل پلٹ دیا۔ وہ شعر پڑھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو بنا کچھ کہے چلے جانا اس کی اس لازوال محبت کی توہین ہو گی۔ شاید مجھے اسی طرح آپ سے ملنا تھا، چاہے پہلی اور آخری مرتبہ ہی سہی۔''

باہر زور سے بجلی کڑکی، ایک لمحے کے لیے کمرے میں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں نے اس

کے لرزتے لبوں پر جمی شبنم کے قطرے بھی دیکھ لیے۔ اُس نے بتایا کہ نگہت سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا فون نمبر معلوم کروانے کے بعد انہیں آج موقع ملا تھا کہ وہ حیا کے ذریعے پڑوس کے ماسٹر صاحب کے گھر سے فون کروا سکے کیونکہ مولوی صاحب دو دن کے لیے شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ایمان نے بتایا کہ یہاں تک پہنچنے میں اُسے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ صرف وہ ہی جانتی ہے اور اگر ایسے میں حیا اور نگہت اس کی مدد نہ کرتیں تو اس کا مجھ سے یوں ملنا ناممکن تھا۔

جانے اتنے دنوں میں اس نازک اندام پر کیا کچھ گزر چکی تھی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ بات کرتے ہوئے بھی باقاعدہ اس کی سانس پھول سی جاتی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، اِک سیدھی سادھی معصوم لڑکی کو میں نے یہ کس پُر خار راستے پر گھسیٹ لیا تھا۔ وہ جس کے کومل قدم پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑیں تب بھی ان کے چھل جانے کا ڈر ہو۔ اسے میں نے کانٹوں پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا، محبت کا زہر اس کے رگ و روپ میں سرایت کر چکا تھا۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور ہی محبت کا تھا۔ مَیں تو خود اُس کی طرح، اس سے کہیں زیادہ بے بس تھا۔ اور پھر قصوروار صرف محبت کو ہی کیوں ٹھہرایا جائے؟۔۔۔۔ اصل قصوروار تو وہ تھا جس نے ہم دونوں کے دلوں میں اس محبت کا بیج بویا، اسے پروان چڑھایا اور اس زہریلی امر بیل کو اس قدر تناور کر دیا تھا کہ آج ہم دونوں اس کے زہر سے بے حال تھے۔ جاں لب دم تھے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور اُسی کا تھا، جو ہم کمزور انسانوں کے دلوں میں یہ جذبہ پروان چڑھا کر پھر صرف تماشا دیکھتا تھا۔

ایمان اب تک سسک رہی تھی۔

''مَیں جانتی ہوں آج مَیں نے اس محبت کا آپ کے سامنے اقرار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید خدا مجھے اس محبت کے گناہ کے لیے کبھی نہ بخشے کہ محبت جب کسی رشتے کے بنا ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ لیکن میرا خدا یہ بھی جانتا ہے کہ آپ سے ملے بنا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں آپ کو اپنے لیے یوں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد میری ساری زندگی اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے میں ہی گزرے گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ اپنے آپ کو میری اس محبت کی وجہ سے مزید نہیں جلائیں گے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔